عروضِ غزل

ڈاکٹر اشرف رفیع

نام کتاب	عود غزل
پہلا اڈیشن	ایک ہزار
سنہ اشاعت	دسمبر ۱۹۸۱ء
خوش نویس	محمد عارف الدین
مطبع	اعجاز پرنٹنگ پریس ، چھتہ بازار ، حیدرآباد
سرِ ورق	محمد رفیع الدین صاحب صدیقی
قیمت	پندرہ روپے

بہ تعاون آندھرا پردیش اردو اکادمی ، حیدرآباد

ملنے کے پتے :

۱۔ الیاس ٹریڈرس ، شاہ علی بنڈہ حیدرآباد
۲۔ ادبی مرکز ، اعجاز پریس چھتہ بازار ، حیدرآباد
۳۔ نیشنل بک ڈپو ، مچھلی کمان ، حیدرآباد
۴۔ جناب بشیر وارثی صاحب ، چھتہ بازار ، حیدرآباد

مُصنّف : ڈاکٹر اشرف رفیع ۱۷ - ۷ - ۱۰۶
یاقوت پورہ ، حیدرآباد ۔ ۲۳

شکریہ!

• — مرشدی و استاذی حضرت مولانا سید معزالدین قادری الملتانی کا ر
ادب، جنھوں نے ناسازیٔ مزاج کے باوجود "تعارف عودِ غزل" لکھنے کو
فرمائی۔

• — اپنے مشفق و مہربان اباجان کا، جو الفاظ میں کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔

• استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا جنھوں نے بہت ہی کم وقت میں
کتاب پر پیش لفظ تحریر فرمایا۔

• — میرے رفیقِ زندگی ایم اے کے فاطمی صاحب کا جنھوں نے عودِ غزل کی کتابت
و اشاعت میں ہر مصیبت کو اپنے سر لیا۔

• — میرے پیارے بھائی اور بہنوں کا جن کی نیک تمنائیں اور آرزوئیں ہمیشہ
بڑھاتی ہیں، خصوصاً ریحانہ قادری کا جس نے گھر کی ہر فکر سے مجھے آزاد
دوستوں اور دشمنوں کا جو کسی نہ کسی طرح میرے شعر کے سانچے میں ڈھلے

• — جناب محمد عارف الدین صاحب خوش نویس کا جنھوں نے کتابت کی تکمیل
تعاون کیا۔

• — آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کا جس کے تعاون سے عودِ غزل شائع ہو سکی

اشرف رفیع

استادِ محترم جناب خاورؔ نوری کی نذر

جن کی رہنمائی نے ابتداً میرے ذوقِ سخن کو جلا دی

فہرس

غزل نمبر		صفحہ نمبر
۱۱	چمن میں گریۂ شبنم پہ آنکھ بھر آئی	۴۰
۱۲	حق نہیں مجھ کو شاد مانی کا	۴۳
۱۳	ہر گام انتظار کسی ہمسفر کا ہے	۴۴
۱۴	یہی کہتے ہیں سب عرفاں کہاں ہے	۴۵
۱۵	ہاتھ میں خُم ہے تو سر پر جام ہے	۴۶
۱۶	قافلہ جس کا ہم نوا نہ ہوا	۴۸
۱۷	جبرِ ناواجبی سے کام نہ لے	۵۰
۱۸	دل کی رُوداد دل لگی نہ سہی	۵۲
۱۹	فسردہ ہے کیوں دل کا گلشن نہ پوچھو	۵۳
۲۰	اے دل تازہ پھول کِھلا دے	۵۴
۲۱	تھا حُسنِ التفات ترا کم بہت ہی کم	۵۶
۲۲	بزم کو دیکھ کر بہ دیدۂ نم	۵۸
۲۳	نہ جانے کیوں تہ و بالا ہے نظمِ مئے خانہ	۶۰
۲۴	عہدِ وفا نہ یاد دلائیں تو کیا کریں	۶۱
۲۵	ہر ایک رُخ سے مجھے لطفِ جستجو آئے	۶۲
۲۶	پردے مری نگاہ کے بھی درمیاں نہ تھے	۶۳
۲۷	ذہنوں کی کج رَوی سے دل بھی بھٹک رہے ہیں	۶۴
۲۸	اپنی خودداری کو رُسوا کیوں کریں	۶۵
۲۹	اور دیوانگی بڑھا دیجیے	۶۶

غزل نمبر		صفحہ نمبر
۴۹	نہ بہاروں سے نہ گلزار سے جی ڈرتا ہے	۹۵
۵۰	وہ راہرو بھی مرے ساتھ چلتے رہتے ہیں	۹۶
۵۱	اے حسرتِ نظارہ جو وہ سامنے آئیں	۹۷
۵۲	قہرِ مجسّم حُسنِ محرم	۹۸
۵۳	اب گلستاں میں بہاروں کا ہے ماتم تنہا	۹۹
۵۴	اجل کا ذکر ہی کیا زندگی نہیں گزری	۱۰۰
۵۵	نہ ہو جو غم تو مسرت کی رہگذر کیا ہے	۱۰۱
۵۶	خود جلوہ گاہ ناز اسیرِ نیاز ہے	۱۰۲
۵۷	منزل رنج و مصائب سے گزر جاتے ہیں	۱۰۳
۵۸	خرد کے راستے میں ایک موڑ ایسا بھی آیا تھا	۱۰۴
۵۹	دل کی اک بات چار سو نہ کرو	۱۰۶
۶۰	یاس چھا جاتی ہے جب آنکھوں میں کاجل جیسے	۱۰۸
۶۱	خندہ روئی سے فریب حُسن کھا سکتے ہیں ہم	۱۰۹
۶۲	شمع محفل جسے بناتے ہیں	۱۱۰
۶۳	خُونِ گل کے ہیں داغ دامن پر	۱۱۲
۶۴	رُلانے کی خاطر نہ کوئی ہنسائے	۱۱۳
۶۵	کچھ وفاؤں پہ ہم کو تھا وشواس	۱۱۴
۶۶	نہ راستوں کا پتہ ہے نہ منزلوں کی خبر	۱۱۶
۶۷	ہر زاویے سے وقت کے سانچے میں ڈھل گیا	۱۱۷

پیش لفظ

جامعہ عثمانیہ کے کم عمر قلم کاروں اور محققین میں ڈاکٹر اشرف رفیع کا اپنا ایک مقام ہے۔ انھوں نے نظم ونثر دونوں میدانوں میں اپنے اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ علی حیدر نظم طباطبائی پر ان کی پُرکاوش تحقیق نے اردو ادب کے سنجیدہ قارئین سے داد تحسین حاصل کی، اور اردو کی اکیڈیمیوں نے انعامات دے کر اس کی پذیرائی کی۔ اب شاعری میں یہ اپنے غزلوں کے مجموعے "عودِ غزل" کے ساتھ منظرِ عام آ رہی ہیں۔

غزل کا آرٹ جتنا پرانا ہے اتنا ہی نیا بھی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں حالی، عندلیب شادانی اور کلیم الدین احمد کے "واروں" سے خیال ہو چلا تھا کہ یہ صنفِ سخن جاں بہ لب ہو جائے گی۔ لیکن اقبال اور ان کے بعد حسرت، فانی، اصغر، جگر، فیض، فراق، مجاز، مجروح، سردار جعفری، ساحر، مخدوم، وجد، ناصر کاظمی، اور قتیل شفائی نے اسے حیاتِ تازہ بخشی اور غزل پھر سے اُردو ادب کی آبرو بن گئی۔

ڈاکٹر اشرف رفیع نے عودِ غزل میں غزل کی طرف مراجعت کی ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اس غواصی میں کئی گوہر آب دار ان کے ہاتھ لگے۔ ان کا انداز کلاسیکی رنگ لئے ہوئے ہے۔ یعنی ردیف و قوافی کی پختہ بندشوں میں خیال آزاد ہے، ذہن و فکر

آزاد ہے۔ اس تنوع فکر میں کہیں غم جاناں ہے تو کہیں غم دوراں لیکن اس کا مطالعہ جذبا
ہی کو سرشار نہیں کرتا، خیالات کو بھی جگاتا ہے۔ دیکھئے چند شعر ؎

کہاں ہوں میں مجھے اپنا مقام یاد نہیں
تمہارا نام ہے یاد، اپنا نام یاد نہیں

یہ پوچھو گلستاں میں کیوں روشنی ہے
مگر ہم سے حال نشیمن نہ پوچھو

مصیبت نے ہمیں اک آئینہ خانہ دکھایا تھا
کہ جس میں مخلصوں کا ایک اک چہرہ پرایا تھا

محکم ہے ربط عشق تو نزدیک و دُور کیا
آئیں تو کیا کریں وہ نہ آئیں تو کیا کریں

تری زباں سے سُنی ہم نے داستان کچھ اور
تری نظر نے سنایا کچھ اور افسانہ

ناقدِ عہدِ خسروی اشرف
آج خود کر رہے ہیں دارائی

اشرف کے اشعار میں غمِ ذات اور غم کائنات دونوں کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ایسی
ایمائیت غزل کی خوبی ہے اور ڈاکٹر اشرف رفیع کے ہاں کوزہ میں سمندر سمویا ہوا نظر آئے
مجھے اُمید ہے یہ مجموعہ غزلیات اہلِ ذوق سے اپنا خراج وصول کرلے گا۔ فقط

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

حیدرآباد

تعارفِ عودِ غزل

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی شاعر کے کلام سے اس کی ذہنی و فکری استعداد کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف رفیع کے زیرِ نظر مجموعۂ غزلیات سے بھی اس امرِ مسلّمہ کا مشاہدہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ فرد کی سیرت کی تعمیر میں اس کی تربیت اور ماحول کے عناصرِ ترکیبی کا عکس اس کے قول و فعل سے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اشرف کی ابتدائی تعلیم و تربیت سے ڈاکٹریٹ کرنے تک کا پورا زمانہ میرے سامنے ہے۔ ایک متوسط خاندان سے ہونے کے باوجود علم و فن کے منتخب تخلیقات ابتدا سے ان کے مطالعے میں رہے۔ ضروری مذہبی تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی قابل اور علم دوست باپ نے السنۂ مشرقیہ کی تعلیم میں انتھک کوشش کی اور قابل و صالح مدرسین کے نقوشِ علمیہ سے ان کے فکر و ذہن کو سنوارا۔ کالج کی تعلیم کے آغاز ہی میں اشرف رفیع کا معیارِ علمی اپنی درسی کتابوں سے بہت آگے پہنچ چکا تھا اور تعلیم و مطالعہ کے فطری ذوق کی جو ان کو اپنے علمی خاندان سے ورثے کے طور پر ملا تھا، خاصی تکمیل ہوئی۔ ایم اے کامیاب کرنے اور ڈاکٹریٹ کی تیاری کے زمانے میں ان کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ ڈاکٹریٹ کے بعد بھی مولانا سید عبدالباقی صاحب شطاری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس عربی ادب و حدیث کا درس جاری رہا۔

شاعری کا ذوق اشرف میں ابتدا ہی سے تھا۔ شعر و ادب و بلاغت و عروض کے مسلسل مطالعے سے اس شوقِ شعرگوئی میں مزید اضافہ ہوا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ اشرف کے فنِ شعرگوئی کو اُجاگر کرنے اور ذوقِ علمی کو نکھارنے میں ان کے پی، ایچ، ڈی کے مقالے کا بڑا ہاتھ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ استادِ معظم علامہ نظم طباطبائی کی علمی وسعتوں کا احصاء کوئی آسان

کام نہیں تھا۔ علامہ طبا طبائی کے نثری و شعری تخلیقات کے تحقیقی مطالعے نے اشرف کی
کو بڑی وسعت عطا کی اور اس کے بعد سے ان کی شاعری نے بھی اکثر نظم طباطبائی کے عکس
قبول کرنے میں پیش رفت کی۔ علامہ طبا طبائی کا اسلوب خواہ شعر میں ہو کہ نظم میں، کسی
سانچے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی فکر بمقدار علم نے رنگا رنگ گل بوٹے کھلائے
سرسری مطالعہ کرنے والا خود نہیں سمجھ سکتا۔ ان کے اسلوب کی تشبیہ کے لئے متقدمین و متا
کے منجملہ کس کا آئینہ سامنے رکھا جائے۔ علم کی ہمہ گیری نے علامہ کو ہمہ داں بنا دیا تھا، ا
شعر میں ان کے رنگ کا تعین مشکل ہو جاتا ہے اور یہ نہیں کہ اصناف سخن میں بلکہ صرف
ایک ہی غزل کے اشعار پر غور کریں تو اس میں مسائلی شاعری، الٰہیات، تصوف، بلا
انتہائی سادہ تغزل اور سلاست نیکھا۔ دیکھ کر صاحبانِ علم کو حیرانی ہوتی ہے کہ ایک
کے اندر کتنی علمی تجلیاں جگمگا رہی ہیں۔ علامہ محترم کی غزل کے چار شعر ملاحظہ ہوں جس
مسائل سے لے کر سلیس تغزل تک جلوہ گر ہے۔

سرو کی طرح اگر بر زدہ داماں ہوتا ٭ مثل غنچے کے نہ میں سر بہ گریباں
ہم کہاں بیٹھ کے رستے میں ترے سر پٹکیں ٭ نقشِ پا کوئی تو اے عمرِ گریزاں
حلقئے تدبیرِ کواکب کے مسلسل رہتے ٭ کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں
دل کا ارمان نکلنا تو ہے مشکل اے نظمؔ
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

غزل کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے ہر شعر میں ایک علمی شخصیت کا مشا
ہو رہا ہے۔ اور مختلف اذہان و افکار نے اس غزل کو سنوارا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ
رفعتوں کو پابند اسلوب کرنے والے یہ سمجھیں کہ علم جب وسیع سے وسیع تر ہو جاتا
پابندیوں اور یک رنگی کے اقطار سے آگے نکل جاتا ہے۔ بہر حال علامہ طبا طبائی جیسے
اقران و امثال عالم کی تخلیقات کے غائر تحقیقی مطالعے نے اشرف کے حدود علمیہ
وسعت پیدا کر دی جس کا مشاہدہ ان کے شعر میں کیا جا سکتا ہے، اور وہی تنوع اور
جو علامہ کی بیان کردہ غزل میں آپ پائیں گے اس کا انعکاس اشرف کے کلام میں۔

گھر کے ماحول کی صالحیت اور تربیت نے ذوقِ علمی کو بھی غیر اخلاقی اور ناشائستہ عناصر سے پاک رکھا۔ اپنے دور کے ہر غیر اخلاقی اور ناستودہ فعل پر اشرفؔ کے کلام میں یا تو حسین طنز ملے گا یا بیباک تنقید۔ یہ شعر پڑھیے۔

اگر انساں میں نہ ہو جرأتِ اظہارِ خیال ٭ ایسے کم مایہ کو انسان نما کہتے ہیں
جس اطاعت سے ہوا مُردہ ضمیرِ انساں ٭ سخت حیرت ہے کہ آپ اس کو وفا کہتے ہیں

کیا خبر کس کو ہے اس دور میں عرفانِ خدا
لوگ ہر صاحبِ دولت کو خدا کہتے ہیں

کسی شاعر کا مشاہدہ اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب علمِ صحیح کی تنویریں اس کی قوتِ ممیزہ کو حقیقت آشنا کر دیتی ہیں۔ وہ اخلاقی کج روی کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا۔ محبت و انسان دوستی کے لطیف جذبات سے بھی اشرفؔ کا دل خالی نہیں۔ کہتے ہیں کہ

وہ کوئی دل نہیں پتھر ہے اصل میں اشرفؔ ٭ جو آدمی کو محبت سے بے نیاز کرے
جس دل سے چھا گئے ہیں وہ قلب و نگاہ پر ٭ ہوتی ہے اب نماز قضا کم بہت ہی کم
کہاں ہوں میں مجھے اپنا مقام یاد نہیں ٭ تمہارا نام ہے یاد اپنا نام یاد نہیں

لیکن اس مجازی محبت پر بھی تربیت و ماحول نے فسق کی بجائے تقدیس کی مہر ثبت کی ہے فطرت کی پاکیزگی اور علم کی طلب، ان دو عناصر کے امتزاج نے اشرفؔ کو میری نظر میں عام سطح سے بلند کر دیا ہے اور ان کے اندر کا شائستہ انسان برابر کہہ اٹھتا ہے، جس کو ہم شعر کا لقب دیتے ہیں کہ:

شبِ غم اتنی معتبر ہو جائے ٭ دُور دل سے غم سحر ہو جائے
جانے کیا انقلاب برپا ہو ٭ دل کی دل کو اگر خبر ہو جائے
دل میں احساسِ غم اگر جاگے ٭ خضر کی عمر مختصر ہو جائے
ننگ ہے آرزوئے چارہ گری ٭ درد خود اپنا چارہ گر ہو جائے

زندگی پر کھلے جو رازِ اجل
آدمی صاحبِ نظر ہو جائے

اشرفؔ کے کلام میں اس قدر تنوع پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے رنگِ غزل گوئی کا تشخص

آسان نہیں۔ اس لئے کہ علمی وسعت کی وجہ نہ جانے کس وقت کوئی علمی تنوع فکر کو روشن کرے اور نطق و بیان کا روپ دھارے ۔ وہ تو خیر گزری کہ علامہ سید عبدالباقی شطاریؒ اشرف کی تعلیمی تکمیل سے پہلے راہیِ فردوس ہو گئے، ورنہ ان کا اٹل ارادہ تھا کہ پی ایچ ڈی ہونے سے کیا ہوتا ہے انھیں افضل العلماء کی سند حاصل کرنی ہے۔ عربی کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔

علمی میدان میں ڈاکٹر اشرف کو ایک چیز اپنے طبقے میں ممتاز حیثیت دیتی ہے۔ وہ ہے علم تصوف ۔ تصوف کا تفصیلی علم کتابوں سے نہیں بلکہ انھوں نے یہ اپنے سلسلۂ بیعت سے سینہ بہ سینہ حاصل کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تصوف کی جھلکیاں اکثر و بیشتر نظر آتی ہے۔

سُنا ہے راز حقیقت اسی حجاب میں ہے
جو دیدہ ور ہے وہی عظمتِ مجاز کرے
سائے مری نظر میں ہیں آئینۂ وجود
ہر عکس میں حقیقتِ آئینہ ساز ہے

اس قسم کے متعدد اشعار اس مجموعے کے مطالعے کے دوران آپ کو ملیں گے جن سے ڈاکٹر اشرف کی معرفت نگاہی کا ثبوت ملے گا۔ مزید لکھنے کے لئے بڑی گنجائش اشرف کے لئے موجود ہے لیکن میرے قلم کو توعینِ دیدہ وراں کھلتی ہے ۔ آخر ان کے علم و آگہی کے لئے ابھی تو اظہار خیال کی گنجائش چھوڑنی ہے اور ممکن ہے کہ جوبات اس بوڑھے ذہن کے اضمحلال کے سبب مستور ہو اس کو وہ مزید روشن بنا کر پیش کریں۔ اس لئے میں اشرف کے اسی حد تک تعارف پر قناعت کرتا ہوں کہ علمی مطالعہ، علما کے فیضان اور فطری صالحیت نے ان میں ہر جہتی فضیلت کو جگہ دی ہے میں اپنے احساس اور جذبۂ علمی سے مجبور ہو کر صرف اس شعر پر اشرف کا تعارف ختم کرتا ہوں کہ محاسنِ قابلیت، علم کی گہرائیوں کا حامل یہ پیکر جمیع صفات و فضائل علمیہ سے آراستہ ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

اللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

فقیر
سید معزالدین قادری الملتانی

دسمبر ۱۹۸۱ء

حمد باری تعالےٰ

تو رحمٰن و رحیم و خالقِ ہر دو جہاں تو ہے
تو ربِّ کُل ہے مختارِ زمین و آسماں تو ہے

ارادے پر ترے موقوف ہے ہستی ہر اک شئے کی
نمود و بود تجھ سے اور سب کا پاسباں تو ہے

تو ہے اوّل تو ہے آخر تو ہے ظاہر تو ہے باطن
خود اپنی ہستیٔ ذاتِ قدم کا رازداں تو ہے

ظہورِ جزو کل، تفصیل تیرے علم مطلق کی
بصیرِ انس و جاں تو ہے، قدیرِ کن فکاں تو ہے

تو ہے بالذّات قائم سب ہیں تیری ذات سے قائم
جو سچ پوچھو تو موجودِ حقیقی بے گماں تو ہے

ظہور ایسا کہ ہر جا ہر مکاں میں جلوہ گر ہے تو
حجاب ایسا کہ ہر اک چشمِ بینا سے نہاں تو ہے

کرے ادراک اشرفؔ کیا احاطہ تیری ہستی کا
ورائے ہر خیال و ہر قیاس و ہر گماں تو ہے

نعتِ شریف

مُحمّد مُصطفیٰ کیا جانے کیا ہو
بشر ہو، نُور ہو، عشقِ خدا ہو

شہودِ اوّل، ظہورِ آخر تمہارا
ازل سے تا ابد جلوہ نُما ہو

تمہارے نُور سے ہر شئے ہے لیکن
ہو شامل سب میں، اور سب سے جُدا ہو

تمہی ہو مُدّعائے علمِ مطلق
شہِ لولاک! فخرِ انبیاء ہو

گلستانِ نبوّت کے گُلِ تر
رسولوں میں حبیبِ کبریا ہو

کرے نُطقِ بشر کس طرح مدحت
کلام اللہ جب وقفِ ثنا ہو

جو تم سے دُور ہے منزل سے ہے دُور
کہ خود رہبر ہو، خود راہِ ہدیٰ ہو

رہینِ دامنِ رحمت ہیں عاصی
تمہی تو شافعِ روزِ جزا ہو

خدا شاہد! یہ ہے ایمان اشرف
وہی ہے جنّتی، تم جس کو چاہو

(۱)

فکر روشن ہے تو، ہے گردشِ ایّام غزل
ہے مری صبح غزل اور مری شام غزل

پھونک دی روحِ عمل، مٹ گیا برسوں کا جمود
دیدہ و دل کی تجلّی کا ہے اک نام غزل

مستیٔ دیدۂ فطرت ہے جو شامل اس میں
کبھی خُم ہے، کبھی مینا ہے کبھی جام غزل

اتنی پابند ہے احساس کی ہر موڑ پہ یہ
کبھی آرام غزل ہے، کبھی آلام غزل

اس سے باطل بھی پلٹ جاتا ہے حق کی جانب
گاتے ہیں مدحِ خدا ہیں کبھی اصنام غزل

انقلاب آفریں ادوار کی خالق ہے یہی
کسی منزل سے نہیں لوٹتی ناکام غزل

چھیڑ دیتا ہے کوئی نغمۂ جذبات کا ساز
میری دنیائے تخیل کی ہے ہر شام غزل

کیا سکوں بخش ہے آزارِ محبت کے لئے
اُن کا پیغام بھی ہے ہجر کا انعام غزل

لے کوئی درسِ وفا حُسنِ غزل سے اشرفؔ
سر پہ کس کس کے اٹھا لیتی ہے الزام غزل

(۲)

دل نے چھیڑی جو غم کی شہنائی
رقص کرتی ہوئی سحر آئی

ہر جگہ اُن کی یاد ساتھ رہی
کب میسّر ہوئی ہے تنہائی

وسعتِ دل کے آگے لگتی ہے
تنگ ارض و سما کی پہنائی

غنچہ و گُل کِھلے چمن مہکا
کتنے پردوں میں ہے خود آرائی

ہر طرف موت ہی کے سائے ہیں
کیا کہیں زندگی کہاں لائی

مسکرانے کو اب ترستے ہیں
مسکرانے کی یہ سزا پائی

آنکھ جھپکی تھی جب وہ آئے تھے
نیند نے موت کی قسم کھائی

غازۂ مصلحت ہے چہروں پر
اصلیت پا سکی نہ بینائی

ناقدِ عہدِ خسروی اشرفؔ
آج خود کر رہے ہیں دارائی

(۳)

کیوں خوشی پہ غم کے بادل چھا گئے
کیا اُجالوں کو اندھیرے کھا گئے

دُور ہی سے ان کو طوفاں کا سلام
دیکھ کر ساحل سے جو گھبرا گئے

کیا بجھے دل کی لگی ان کے بغیر
آج بادل آگ سی برسا گئے

ذرّہ ذرّہ کانپتا جن کے دل میں درد
ان کی بیدردی سے دل تھرّا گئے

اب سمجھ والوں کو ہوش آیا تو کیا
نا سمجھ کب کے ہمیں سمجھا گئے

دوسروں کی زندگی کے دشمنو!
کیا اجل سے تم رہائی پا گئے

راہِ مقصد میں اگر حائل ہوا
رہروِ گمراہ کعبہ ڈھا گئے

روک لیجے اب تو اپنے قہقہے
آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

ہو گئی بزمِ سخن میں روشنی
کیا غزل پڑھنے کو اشرف آ گئے

(۴)

بات ہے آپ کی غضب کی بات
کاش فرماتے کوئی ڈھب کی بات

مختلف ہے زبانِ دشمن و دوست
ایک ہوتی نہیں ہے سب کی بات

جھنجھنا اُٹھے سازِ دل سب کے
الاماں! تیرے زیرِ لب کی بات

آشیانہ کہاں، کہاں یہ قفس
اب کسے یاد ہو گی جب کی بات

دل نے آخر نگاہ کو ٹوکا
بے ادب کہہ گیا ادب کی بات

دردِ دل پوچھ، درد والوں سے
جاں بہ لب جانے جاں بہ لب کی بات

موسمِ گُل پہ تبصرہ ہے عبث
غنچہ و گُل سے تم نے کب کی بات

سب کے لب پر ہیں تذکرے گُل کے
کوئی کہتا نہیں ہے اب کی بات

شمع روشن ہوئی ہے آخرِ شب
صبح کو یاد آئی شب کی بات

دل کو بھائی بس اُن کی بات اشرف
یوں تو سُننے کو سُن لی سب کی بات

۵

موت سے نہیں کچھ کم منّتِ پذیرائی
جی اٹھیں گے ہم خود ہی رہنے دو مسیحائی

میرے ہم نشیں جب سے دور ہیں مرے دل سے
دیکھئے تو محفل ہے سوچیے تو تنہائی

پہلے بے قسم ہم نے بات مان ہی لی تھی
سوچنا پڑا ہم کو تم نے جب قسم کھائی

ان کے سخت تیور میں ان کی نرم باتوں میں
بانکپن ہے خاروں کا اور گلوں کی رعنائی

کوئی غم نہیں اس کا تم اگر ہنسیں مجھ پر
اپنی خستہ حالی پر خود مجھے ہنسی آئی

میری ہر دُعا کا ہے آج کل اثر اُلٹا
موت کی تمنّا پر زیست کی سزا پائی

قصر تو ہے عالی شان، قمقمے ہیں زخموں کے
یہ سکون و راحت کی جُستجو کہاں لائی

آپ کی نگاہوں میں کیسی اجنبیّت ہے
کیا کبھی نہ تھی ہم سے آپ کی شناسائی؟

یہ سمجھ کے میں اشرفؔ اپنے حال پر خوش ہوں
کیا خبر دکھائے کیا وقتِ نَو کی انگڑائی

٦

سب لوگ آج راہِ مخالف پہ چل پڑے
منزل کی سمت ہم تنِ تنہا نکل پڑے

ساقی بہ قدرِ ظرف پلا بادہ خوار کو
ہوش و حواس میں نہ کسی کے خلل پڑے

اچھی طرح سمجھ کے زباں اپنی کھولئے
ایسا نہ ہو کہ بات خلافِ عمل پڑے

نشتر زنی سے طنز کی اب باز آئیے
کتنے دلوں سے خون کے چشمے ابل پڑے

کانٹوں کے انتقام کی شاید خبر نہ تھی
پھولوں پہ ہاتھ ڈالنے والے اچھل پڑے

وہ پوچھتے ہیں حال مرا، کیا جواب دوں؟
ڈر ہے کہ دل کی بات نہ منہ سے نکل پڑے

تقدیر کے خطوط بدلتے رہے مگر
دم بھر بھی ابروؤں میں ہماری نہ بل پڑے

ہر آہِ زیرِ لب سے بھی برتی ہے احتیاط
شاید کہ خوابِ ناز میں ان کے خلل پڑے

اشرفؔ قدم اٹھے تو ہیں راہِ حیات میں
کیا کیجیے جو راہ میں شہرِ اجل پڑے

(۷)

کہاں ہوں میں مجھے اپنا مقام یاد نہیں
تمہارا نام ہے یاد، اپنا نام یاد نہیں

بس اتنا یاد ہے خود آپ نے کیا تھا سلام
مگر وہ آپ کا طرزِ سلام یاد نہیں

جنونِ راہ روی میں چلے تھے منزل کو
جہاں سے ساتھ ہو تم وہ مقام یاد نہیں

ہر آرزو پہ کئے ہم نے سینکڑوں سجدے
ہے کون اس میں تمنّائے خام یاد نہیں

نظر نظر میں ہوئیں ان سے کتنی ہی باتیں
بہ قیدِ لفظ و صدا اب کلام یاد نہیں

تمہاری دُھن ہے تمہاری ہی یاد ہے ہر دم
یہی ہے کام، کوئی اور کام یاد نہیں

تمہارے در سے کبھی سر نہ اٹھ سکا اپنا
اب اس کے آگے کوئی احترام یاد نہیں

شعور اتنا ہے اب درد ہی ہے اپنی حیات
لیا ہے مال مگر اس کے دام یاد نہیں

گزارنا تھا، گزاری ہے زندگی اشرفؔ
کہاں سحر ہوئی اور کیسے شام یاد نہیں

ہر ایک پھول ہوس کا شکار ہو نہ سکا
ہمارے ہاتھ سے خونِ بہار ہو نہ سکا

دماغ تھک گئے دل بجھ گئے مگر اب تک
تعینِ ہوسِ اقتدار ہو نہ سکا

بہار ڈھونڈتی آئی ہمیں بیاباں تک
اسیرِ شوق ہمارا غبار ہو نہ سکا

مری نگاہ تھی اہلِ ستم کے چہروں پر
مگر تعارفِ ناخوشگوار ہو نہ سکا

مجھے سنبھال لیا خود مرے تبسّم نے
ذرا بھی جذبۂ غم آشکار ہو نہ سکا

یہ کیسی بے حسی، اپنا ہی رنگِ بربادی
کسی نظر پہ، کسی دل پہ بار ہو نہ سکا

اُنھیں حدود میں تاریکیوں کا ڈیرا ہے
نئی سحر کا جہاں انتظار ہو نہ سکا

وہ دل نہیں ہے کسی احترام کے قابل
غمِ عوام میں جو بے قرار ہو نہ سکا

حقیقتاً اسے جینے کا حق نہیں اشرفؔ
نوائے وقت پہ جو ہوشیار ہو نہ سکا

(۹)

ضرور چشمِ تماشا چمن پہ ناز کرے
مگر بہار و خزاں میں تو امتیاز کرے

مری حیات کا مقصد ہے صرف لذّتِ غم
کوئی یہ سلسلۂ غم ذرا دراز کرے

جُنوں کے دور میں ہو جس کو شوقِ گُل چینی
چمن میں کیسے وہ کانٹوں سے احتراز کرے

یہی ہے خالقِ جذبات کا کرم شاید
تمہیں خوشی سے ہمیں غم سے سرفراز کرے

نہ کیجیے کسی گستاخیٔ جنوں کا ملال
کسے ہے ہوش کہ فرقِ نیاز و ناز کرے

رہِ وفا میں تمنّائے التفات ہے کفر
جو جی میں آئے وہ حسنِ کرشمہ ساز کرے

جبینِ شوق تو رکھ دی ہے میں نے در پہ ترے
یہ تیرا کام ہے بابِ کرم بھی باز کرے

سُنا ہے رازِ حقیقت اسی حجاب میں ہے
جو دیدہ ور ہو وہی عظمتِ مجاز کرے

وہ کوئی دل نہیں پتھر ہے اصل میں اشرف
جو آدمی کو محبّت سے بے نیاز کرے

(۱۰)

روکتا کون ہے، تم دل میں نہاں ہو جانا
دوست بن کر نہ کہیں دشمنِ جاں ہو جانا

شبِ تاریک میں بھی راہ دکھانا ہے مجھے
اے نشاناتِ قدم، کاہکشاں ہو جانا

تجھ کو کہنا ہے اگر قصّہ بربادیِ گُل
خار کی طرح ذرا سخت زباں ہو جانا

مجھ سے دنیا کو نہیں جنگ کا خطرہ کوئی
تم ہی پیغامبرِ امن و اماں ہو جانا

صاف الفاظ میں کہنے سے کہیں بہتر ہے
حرفِ مطلب کا نگاہوں سے عیاں ہو جانا

تری پُر کیف نگاہوں کا اشارہ تو نہیں
آنسوؤں کا مری پلکوں پہ گراں ہو جانا

دیکھنا ہے جو دو عالم کا تماشا مجھ کو
مجھ سے ممکن نہیں پابندِ مکاں ہو جانا

شکوہ رہ جائے اگر دل میں تو کینہ بن جائے
صاف گوئی ہے یہی، حرفِ زباں ہو جانا

ہر ستم کش کے لئے سہل نہیں ہے اشرف
درد بن کر دلِ انساں میں نہاں ہو جانا

(۱۱)

چمن میں گریۂ شبنم پہ آنکھ بھر آئی
بہار میں بھی خزاں کی جھلک نظر آئی

امیدوارِ سحر پر نہ جانے کیا گزری
رہی دعائے سحر لب پہ جب سحر آئی

بگڑ کے آئے تھے وہ آج خیر، آ تو گئے
کم از کم اتنی تمنّا تو آج بر آئی

اجل کو دیکھ کے دل چیخ اٹھا شبِ وعدہ
میں انتظار میں ان کے ہوں تو کدھر آئی

رہِ حیات میں جب حادثات بڑھنے لگے
سمجھ میں آیا محبّت کی رہگذر آئی

ہزار بار ملا اِذنِ دید ہم کو مگر
نگاہ اپنی ہی ہر بار بے خبر آئی

کِھلے ہیں پھول جہاں خار بھی وہیں اُبھرے
اجل کے ساتھ ہمیں زندگی نظر آئی

رہِ وفا میں دلِ ناتواں بھٹک نہ سکا
تمہاری یاد بہ اندازِ راہبر آئی

تلاشِ حق میں بڑی مشکلات ہیں اشرفؔ
ذرا سنبھل کے چلو راہ پُرخطر آئی

(۱۴)

حق نہیں مجھ کو شادمانی کا
شکریہ غم کی مہربانی کا

آپ کے اور ہمارے آنسو میں
فرق ہے آگ اور پانی کا

ہے محبت کا نام عمرِ ابد
ذکر ہی کیا حیاتِ فانی کا

خود مرے دل نے میری آنکھوں کو
فرض سونپا ہے خوں فشانی کا

اہلِ دل کی کہانیاں تو یہ
ایک عنواں ہے ہر کہانی کا

کیوں نہ سرگوشیاں ہوں محفل میں
فیض ہے میری بے زبانی کا

تیرے غم سے سوا یہ غم ہے ہمیں
جانے کیا ہو تری نشانی کا

شعر رودادِ دل ہے نام نہیں
صرف الفاظ کی روانی کا

کارواں کے غبار میں اشرفؔ
چھُپ گیا رنگ زندگانی کا

ہر گام انتظار کسی ہمسفر کا ہے
بے چین ذرّہ ذرّہ تری رہ گذر کا ہے

یوں میکدہ میں بکھرے ہوئے جام دیکھ کر
چھلکا ہوا سا جام مری چشمِ تر کا ہے

اے ہم قفس خموش ہیں کیوں اہلِ آشیاں
جو حال ہے اِدھر کا وہی کیا اُدھر کا ہے

کیوں تم مریضِ غم کی طرف دیکھتے نہیں
تم چارہ گر ہو فرض بھی کچھ چارہ گر کا ہے

وہ آئیں یا نہ آئیں، مگر ہم ہیں منتظر!
یہ انتظار ختم ہو گیا عمر بھر کا ہے

مسجد بھی میکدہ بھی ہے واعظ کے سامنے
کوئی نہ پوچھ بیٹھے ارادہ کدھر کا ہے

اشرفؔ ہے کس کو حُسنِ تبسم کا اعتبار
دل صاف کہہ رہا ہے دھوکا نظر کا ہے

۱۴

یہی کہتے ہیں سب عرفاں کہاں ہے
مگر پہچانئے انساں کہاں ہے

ہم ان کی منزلوں کو ڈھونڈھ لیتے
مگر ان کا پتہ آساں کہاں ہے

کوئی بھی نام دے لیں آپ سُن کر
فسانے کا مرے عنواں کہاں ہے

گزرتے ہی نہیں فرقت کے لمحے
صدادو گردشِ دوراں کہاں ہے

تمنّا ہے وہ سُن لیں بات اپنی
مگر اس بات کا امکاں کہاں ہے

تڑپتی، چیختی ہے جسم میں جاں
بتائے کوئی جانِ جاں کہاں ہے

ہیں اشرف ہر نظر میں تیر و نشتر
یہ پوچھو زخم کا درماں کہاں ہے

(۱۵)

ہاتھ میں خُم ہے تو سَر پر جام ہے
میکدے میں بدحواسی عام ہے

زندگی یہ بھی ہے کوئی زندگی!
ہر نفس اک موت کا پیغام ہے

مجھ پہ ہر رُخ سے ہے الزامِ جفا
کیا وفاؤں کا یہی انعام ہے

انتخابِ راہ، فرضِ راہبر
جادہ پیمائی ہمارا کام ہے

جینے والو موت سے ڈرتے ہو کیا
موت ہی کیا زیست کا انجام ہے؟

دیکھ لیں پھولوں کو مرغانِ چمن
اتنی آزادی تو زیرِ دام ہے

غم کی تاریکی میں ہوں آٹھوں پہر
کون جانے صبح ہے یا شام ہے

کب مرے ہونٹوں پہ آئی ہے ہنسی
دوستو یہ مجھ پر کھُلا الزام ہے

دوستوں کا حال کچھ اشرفؔ سے پوچھ
دشمنوں کا نام تو بدنام ہے

(۱۶)

قافلہ جس کا ہم نوا نہ ہوا
وہ کبھی منزل آشنا نہ ہوا

شبِ تیرہ پہ کچھ نہیں موقوف
صبحِ روشن میں کہئے کیا نہ ہوا

اُٹھ رہا تھا سوالِ خودداری
ہم سے اظہارِ مدّعا نہ ہوا

پھول سب چُن کے باغباں نے کہا
کچھ بہاروں کا حق ادا نہ ہوا

ہم دُعا مانگ کر بھی پچھتائے
کچھ بھی اپنا کہا سُنا نہ ہوا

دیکھ کر ربطِ شمع و پروانہ
شکر ہے وہ چراغ پا نہ ہوا

وہ سفینے کو لا کے ساحل تک
ناخدا ہی رہا، خدا نہ ہوا

خاک برباد ہو گئی اُس کی
مٹ کے جو تیرا نقشِ پا نہ ہوا

غمِ جاناں کی فکر میں اشرف
غمِ دوراں سے رابطہ نہ ہوا

جبر نا واجبی سے کام نہ لے
بے گناہوں سے انتقام نہ لے

ٹھوکریں کھانے والے خود ہی سنبھل
کبھی دامن کسی کا تھام نہ لے

آدمی، آدمی نہ ہو گر وہ
اپنی ہر سانس سے پیام نہ لے

دوستی کی سزا ملی اے دل!
اب کبھی دوستی کا نام نہ لے

کہہ رہا ہے یہ نظمِ میخانہ
چھین لے، مانگ کے تو جام نہ لے

کچھ نہ کچھ ربطِ باہمی تو رہے
اک نظر دیکھ لے سلام نہ لے

وہ تکلّف کریں نہ باتوں میں
کوئی بھولے سے میرا نام نہ لے

اس کا کردار ہے بہت ہی بلند
دشمنوں سے جو انتقام نہ لے

کیسے ممکن ہے دہر میں اشرفؔ
آدمی، آدمی سے کام نہ لے

(۱۸)

دل کی رُوداد، دل لگی نہ سہی
سُن تو لیجے کبھی، ابھی نہ سہی

دیکھ کر مجھ کو پھیر لیں نظریں
ان کے چہرے پہ برہمی نہ سہی

ان کا جلوہ تو ہر مقام پہ ہے
عام، فیضانِ دید ہی نہ سہی

میرے ایقان میں کمی کیوں ہے
آپ کے لُطف میں کمی نہ سہی

جبرِ ہستی ہے ناگزیر اشرفؔ
زندگی آج زندگی نہ سہی

(۱۹)

فسردہ ہے کیوں دل کا گلشن نہ پوچھو
جلا کب، امیدوں کا خرمن نہ پوچھو

ذرا اک نظر، مخلصوں کی طرف بھی
ہمارا ہے اب کون دشمن نہ پوچھو

یہ پوچھو گلستاں میں کیوں روشنی ہے
مگر ہم سے حالِ نشیمن نہ پوچھو

پھر اک دوسرا کوئی پھینکے نہ پتھر
شکستہ ہے کیوں دل کا درپن نہ پوچھو

تم اپنے سوالوں پہ خود غور کر لو
ہمارا ہے دل کس کا مسکن نہ پوچھو

ہیں کانٹے بھی اپنے چمن ہی کے کانٹے
ہوا دھجیاں کیسے دامن نہ پوچھو

تصوّر میں اشرفؔ کے اک نقشِ پا ہے
ہے خم کس لئے آج گردن نہ پوچھو

(۲۰)

اے دلِ تازہ پھول کھلا دے
اشکوں میں کچھ خون ملا دے

باتوں میں تلخی ہے بہت کم
طنز کا بھی کچھ زہر ملا دے

دل ہے دھندلا روک نہ آنسو
آئینہ کو اور جِلا دے

ہاتھ بندھے ہیں ہر میکش کے
ساقی تو ہی جام پلا دے

دیکھ کے تجھ کو کتنے شکوے
بھول گئے ہم یاد دلا دے

ساغر و مینا چھیننے والے
آنکھوں سے دو گھونٹ پلا دے

ہم نے کی بے لاگ پرستش
ہم نہیں کہتے کوئی صلا دے

اشکوں کی شبنم ہم دیں گے
ہنس ہنس کر تو پھول کھلا دے

پھول کہے کیوں ان سے اشرف
چاک گریباں میرا سلا دے

تھا حُسنِ التفات ترا کم بہت ہی کم
مل کر بھی تجھ سے درد ہوا کم بہت ہی کم

جب سے ملا ہے منزلِ تسلیم کا پتہ
اٹھا ہے اپنا دستِ دعا کم بہت ہی کم

جس دن سے چھا گئے ہیں وہ قلب و نگاہ پر
ہوتی ہے اب نماز قضا کم بہت ہی کم

دیکھا تھا بے حجاب اُنھیں چھن گئی نظر
ہے اس گناہ کی یہ سزا کم بہت ہی کم

اس دورِ ارتقا میں کمی کچھ نہیں مگر
ہے صرف ایک جنسِ وفا کم بہت ہی کم

یہ چاند سے قریب ہے انسانیت سے دور
انساں بلند ہو کے ہوا کم بہت ہی کم

حیرت ہے پاؤں رکھتے ہی منزل کو پا لیا
دل رہگذر میں ان کی چلا کم بہت ہی کم

اب تک اسی صدا سے مرے بج رہے ہیں کان
گرچہ سُنی ہے ان کی صدا کم بہت ہی کم

اشرفؔ ہیں دل شکن تو بہت اس جہان میں
لیکن ہے دردِ دل کی دوا کم بہت ہی کم

بزم کو دیکھ کر بہ دیدۂ نم
ہم یہ سمجھے چراغ ہے مدھم

دو قدم ہی پہ تھک کے بیٹھ گئے
وہ چلے جب مرے قدم بہ قدم

بڑھ گئی اور تشنگی سب کی
ساقیا تیری چشم نم کی قسم

گُل شگفتہ بھی ہیں فسردہ بھی
ہیں بہار و خزاں چمن میں بہم

سوچتے یہ ہیں سر جھکائیں کہاں
اک طرف دیر، اک طرف ہے حرم

میرے ہمدرد کو خبر ہی نہیں
پرسشِ غم ہے وجہ شدتِ غم

کیسے قائم رہے توازنِ دل
غم زیادہ ہے اور مسرت کم

ان کو سب کچھ ہمیں سے کہنا ہے
اور ہمیں پر ہے التفات بھی کم

حسبِ وعدہ وہ آگئے اشرفؔ
رہ گیا ان کی دوستی کا بھرم

نہ جانے کیوں تہہ و بالا ہے نظمِ میخانہ
کہیں ہے خُم، کہیں شیشہ، کہیں ہے پیمانہ

مثال شمع ہے محفل پہ بے حِسی طاری
تڑپ تڑپ کے جلا جا رہا ہے پروانہ

وہ قہقہوں کی کئے جا رہے ہیں فرمائش
ہم آنسوؤں کا دیئے جا رہے ہیں نذرانہ

تری زباں سے سُنی ہم نے داستاں کچھ اور
تری نظر نے سُنایا کچھ اور افسانہ

کسے نصیب ہے اشرفؔ چمن میں ہوشِ بہار
بھری بہار میں ہر دل ہوا ہے دیوانہ

عہدِ وفا نہ یاد دلائیں تو کیا کریں
ہم ان کو حالِ دل نہ سُنائیں تو کیا کریں

جن سے نہیں ہے آپ کی منزل کو واسطہ
اُن راستوں سے لوٹ نہ جائیں تو کیا کریں

وہ ہر طرف ہیں سمت کی جب قید ہی نہیں
دیر و حرم میں سر نہ جھکائیں تو کیا کریں

محکم ہے ربطِ عشق تو نزدیک و دُور کیا
آئیں تو کیا کریں وہ نہ آئیں تو کیا کریں

ہے اعتبارِ وعدہ، نہیں اعتبارِ زیست
تشریف لا کے ہم کو نہ پائیں تو کیا کریں

مانا کہ ہم کو تابِ نظر ہے نہ شوقِ دید
رُخ سے وہ خود ہی پردہ اٹھائیں تو کیا کریں

اشرفؔ کو تھا عمل سے زیادہ کرم پہ ناز
کام آ گئی ہیں اس کی خطائیں تو کیا کریں

ہر ایک رُخ سے مجھے لطفِ جستجو آئے
ذرا وہ اور قریبِ رگِ گلو آئے

مآلِ نازِ خودی کیا ہے یہ تو سمجھا دوں
جنھیں ہو نازِ خودی میرے رُوبرو آئے

بغیر اذن ہی ساقی نے کرلیا قبضہ
ہمارے واسطے جب ساغر و سبو آئے

قدم قدم پہ ہے خود دارئِ حیات کا ڈر
مری زبان پہ کیا حرفِ آرزو آئے

تری فضائے محبّت ہو خوشگوار اتنی
نفس نفس سے خلوص و وفا کی بُو آئے

کبھی تو ہو خلشِ خار پر تبسم نو
خدا کرے کبھی تجھ میں گلوں کی خُو آئے

ہمارے دل میں عداوت رہے گی کیا اشرف
نظر جُھکائے ہوئے جب کوئی عدو آئے

(۲۶)

پردے ہری نگاہ کے بھی درمیاں نہ تھے
کیا کہیے اُن کے جلوے کہاں تھے کہاں نہ تھے

جس راستے سے لے گئی تھی مجھ کو بے خودی
اُس راہ میں کسی کے قدم کے نشاں نہ تھے

اس التفاتِ خاص کا اے برق شکریہ
لیکن چمن میں اور بھی کیا آشیاں نہ تھے

راز آشنا ہے میری نظر یا پھر آئینہ
ورنہ وہ اپنے حُسن کے خود رازداں نہ تھے

کچھ بے صدا بے لفظ، نظر کہہ گئی ضرور
مانا لبِ خموش رہینِ بیاں نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ جیسے کبھی مہرباں نہ تھے

اشرفؔ فریبِ زیست ہے کب امتحاں سے کم
اس کے سوا تو اور یہاں امتحاں نہ تھے

(۲۷)

ذہنوں کی کج روی سے دل بھی بھٹک رہے ہیں
انسان ہی کے ہاتھوں انساں سسک رہے ہیں

کچھ اور پی رہے ہیں اب ہوش کھونے والے
پیاسوں سے دور کتنے ساغر چھلک رہے ہیں

اس دورِ نو میں ایسا محسوس ہو رہا ہے
کچھ لوگ بے پئے بھی یونہی بہک رہے ہیں

وہ گردِ راہ بن کر رستے میں رہ نہ جائیں
جو دور ہی سے اپنی منزل کو تک رہے ہیں

ماضی کے ذکر میں ہے کتنا سکون اشرف
باسی ہیں پھول لیکن پھر بھی مہک رہے ہیں

(۲۸)

اپنی خود داری کو رُسوا کیوں کریں؟
اُن سے ہم عرضِ تمنّا کیوں کریں؟

کیوں سنائیں اُن کو اپنا حالِ دل
دل کے زخموں کا تماشا کیوں کریں؟

جہدِ پیہم سے سنواریں زندگی
صرف قسمت ہی پہ تکیہ کیوں کریں؟

درد کی جب آخری حد آ گئی
چارہ گر زحمت گوارا کیوں کریں؟

ہو گیا ہے آشیاں نذرِ بہار
بے سبب بجلی کا شکوا کیوں کریں؟

کچھ نہیں موسم بجز ذوقِ نظر
ہم بہاروں کا تقاضا کیوں کریں؟

اپنے بل بوتے پہ ہو، جو کچھ بھی ہو
اشرفؔ اوروں کا بھروسا کیوں کریں؟

اور دیوانگی بڑھا دیجیے
بے گناہوں کو یہ سزا دیجیے

میرے اشکوں سے روشنی لے کر
بجھنے والے دیئے جلا دیجیے

بعد چہروں پہ ڈالئے گا نقاب
پہلے سب کے نقاب اٹھا دیجیے

کیوں رہے ذوقِ بندگی کا نشاں
میرا نقشِ جبیں مٹا دیجیے

جل چکے ہیں تمام پروانے
بزم سے شمع کو ہٹا دیجیے

ساتھ دیتے نہ شب پرستوں کا
سحر آتی ہے راستا دیجیے

ہم تو طوفاں پسند ہیں اشرفؔ
اہلِ ساحل کو کیا صدا دیجیے

کچھ تو انصاف کرو اس دلِ ناکام کے ساتھ
کوئی پیغام تو ہو گردشِ ایّام کے ساتھ

باعثِ کربِ مسلسل ہی رہا جس کا خیال
دل کو تسکین بھی ہوتی ہے اسی نام کے ساتھ

پی کے ساقی ترے اسرار سمجھ لیتا ہوں
ہوشِ احساس نہ دے آج مجھے جام کے ساتھ

آپ کی بزم کے آداب نرالے دیکھے
مجھ کو محفل سے اُٹھایا مگر اکرام کے ساتھ

نام جپنے کا ترے کس کو سلیقہ آیا
نہ ہو در پردہ تمنّا بھی ترے نام کے ساتھ

نا اُمیدی کی حدوں ہی میں سکوں تھا اشرفؔ
اضطراب اور بڑھا ہے کسی پیغام کے ساتھ

آنکھوں آنکھوں میں گفتگو تو ہوئی
خیر تکمیلِ آرزو تو ہوئی

ان سے کچھ کم نہیں خیال ان کا
ان کی تصویر رُوبرو تو ہوئی

گو ادھوری رہی وفا کی بات
کچھ سہی بات رُوبرو تو ہوئی

آئے ہیں لوگ سیرِ گلشن کو
اس قدر قدرِ رنگ و بُو تو ہوئی

آج نظروں میں اضطراب سا ہے
آپ کو میری جستجو تو ہوئی

میکدہ یاد آگیا غم میں
شہرتِ ساغر و سبو تو ہوئی

دیکھ کر ہنس دیئے وہ محفل میں
آج اُمید سُرخرو تو ہوئی

بام پر جلوہ گر وہ ہوں کہ نہ ہوں
ہر نظر آج ایک سو تو ہوئی

اشکِ غم رائگاں نہ تھے اشرف
ان سے سیرابِ آرزو تو ہوئی

ہر آرزو ننھی سپنا جو کچھ بھی من میں چھپتے
جیون کی ہر ڈگر میں ست اور پریم جیتے

ان کے نگر میں کیا ہے بس درد کی کراہیں
سُکھ چین سے وہی ہیں جو ان کے ہیں چہیتے

کانٹوں کی دوستی کا یہ پھل ملا ہے ہم کو
اب ہاتھ تھک گئے ہیں دامن کو سیتے سیتے

اب جام کیا ملے گا نظریں نہیں ملی ہیں
وہ ہاتھ سے جو دیتے ہم زہر تک بھی پیتے

ٹلتی نہیں ہے سر سے اب یہ برہ کی گھٹنا
بیکار ہو گئے سب منتر ہوں یا فلیتے

بیتے ہوئے زمانے اشرف پلٹ کے آئیں
کچھ اور ہم جو جیتے اس آرزو میں جیتے

یہ جنّت سے کم اپنا گلشن نہیں ہے
فقط اک ہمارا نشیمن نہیں ہے

ہوئے آتشِ عشق سے خشک آنسو
یہ چیترا کی ہے دھوپ ساون نہیں ہے

بہاروں میں بھی آرزو ہے ادھوری
گریباں اگر ہے تو دامن نہیں ہے

نظر کی نظر ہی سے کچھ بات ہوتی
چھلاوا ہے یہ ان کا درشن نہیں ہے

جلے گا نہ برقِ تبسّم سے اشرفؔ
یہ ارمانِ دل کوئی خرمن نہیں ہے

رہ کے گمنام نام پیدا کر
آپ اپنا مقام پیدا کر

کوئی خیرات میکدہ سے نہ لے
اپنے حصّے کا جام پیدا کر

ساری دُنیا ہے مِصر کا بازار
بن کے بے دامؔ دام پیدا کر

اشہبِ وقت کی بدل رفتار
کچھ نئے صبح و شام پیدا کر

چاند ہی رفعتوں کی حد تو نہیں
اس سے اُونچا مقام پیدا کر

وقت کے ساتھ گھُومنے والے
اپنے دل میں قیام پیدا کر

عالمِ انتشار سے اشرفؔ
اک مُرتّب نظام پیدا کر

تلخیٔ مئے سے ہمرخوشی لیجیے
کم سے کم ایک بار پی لیجیے

شمع کی طرح رو کے جینا کیا
پھول کی طرح ہنس کے جی لیجیے

کچھ تو لیجیے بہارِ ہستی سے
نہ سہی پھول پنکھڑی لیجیے

عشق کی رفعتیں نہ ہوں رسوا
دامنِ چاک چاک سی لیجیے

موت اس دور میں نہیں مشکل
حوصلہ ہے تو زندگی لیجیے

شعر میں لوگ کیا نہیں کہتے
آپ اشرفؔ کی بات ہی لیجیے

میری سادہ دلی نہیں جاتی
آپ کی برہمی نہیں جاتی

محفلِ ناز ہو کہ بزمِ نیاز
میری خود آگہی نہیں جاتی

ڈوبنے والے ڈوب جاتے ہیں
ساحلوں کی ہنسی نہیں جاتی

جس سے ٹوٹے کسی کا شیشۂ دل
بات ایسی کہی نہیں جاتی

کھول دو ذہن کے دریچوں کو
قلب تک روشنی نہیں جاتی

ٹکڑے چن کر بھی کیا کروں ساقی
ٹوٹے ساغر سے پی نہیں جاتی

صرف الفاظ کا ذخیرہ ہے
شاعری یوں تو کی نہیں جاتی

اپنی فطرت کو کیا کروں ساقی
بات کڑوی کہی نہیں جاتی

دشمنِ جاں ہے جانِ جاں اشرف
بددعا بھی تو کی نہیں جاتی

مہرِ وجود ہی کی ہمیشہ ضیا ہے
یا میں رہوں جہاں میں یا میرا خدا رہے

کچھ لوگ توڑ دیتے ہیں خاموش کتنے دل
اس جرمِ بے صدا کی بھی کچھ تو سزا رہے

نیکی پہ آ ہی جاتے ہیں اکثر بدی کے وار
کانٹوں کی زد سے پھول کہاں تک بچا رہے

وہ کیا کسی کی بات پہ ایمان لائیں گے
جب تک غرورِ حسن کا نشہ چڑھا رہے

ہم خارزار میں بھی رہے ہیں تمہارے ساتھ
یہ گلستاں ہے اس میں ہماری بھی جا رہے

مانا خلوصِ دل نہیں محتاجِ التفات
اتنا تو ہو کہ ان کو بھی پاسِ وفا رہے

اک فاصلہ تو قرب کی ہر انتہا پہ تھا
سائے کی طرح ساتھ رہے ہم تو کیا رہے

اشرفؔ بہ جبرِ درد بھی دل پہ اختیار
بھیگیں نہ پلکیں لاکھ اگر دل بھرا رہے

وجہ تخلیقِ حُسن، حُسن مآب
کیا لکھوں آپ کو حُضور القاب

دار پر سب ہی سر نہیں چڑھتے
سرفرازی کے بھی ہیں کچھ آداب

آگیا کیا خیالِ پروانہ
شمع کی لَو ہے کس لئے بیتاب

وقت کی تُند و تیز آندھی میں
کتنے چہروں سے اُٹھ گئے ہیں نقاب

آپ تاویلِ ایں و آں نہ کریں
وقت کر لے گا خود حساب کتاب

میکدوں کا یہ حال ہے ساقی
رہ گئے جام، بہہ گئی ہے شراب

کچھ نہ کچھ آج ہونے والا ہے
میری تعریف کرتے ہیں احباب

کیا کتابِ حیات میں یارب
آدمیّت کا بھی ہے کوئی باب

کاروبارِ حیات میں اشرفؔ
موت ارزاں ہے، زندگی نایاب

آپ نے وعدہ جب وفا نہ کیا
ہم نے بھی ترکِ مدّعا نہ کیا

آپ پردے میں خود ہی رہ نہ سکے
رازِ بُت خانہ ہم نے وا نہ کیا

ان کی باتوں میں آ کے ہم نے اُنھیں
یہ غنیمت ہوا خدا نہ کیا

تم تو رہزن کی بات کرتے ہو
رہنماؤں نے میرے کیا نہ کیا

اپنی تصویر دیکھ لی ہوگی
دل کا پھر اس نے سامنا نہ کیا

ہر جفا دے رہی تھی اک پیغام
ہم ہی ناداں تھے اس نے کیا نہ کیا

غم دیا اور لذّتِ غم بھی!
یہ کسی نے ترے سوا نہ کیا

کوئی انساں ہے وہ بھی اے اشرفؔ
جس نے انساں کا حق ادا نہ کیا

(۴۰)

صرف گروہوں میں بٹ بٹ کے
کتنے مسافر راستہ بھٹکے

ساتھ رہو دو گام اگر تم
گم ہو جائیں فاصلے گھٹ کے

وقت نے جاتے جاتے ہم پر
خوب کیے ہیں وار پلٹ کے

ایسی بھی آئی تھیں بہاریں
کانٹے بن کر پھول بھی کھٹکے

ہم بھی واقف کار ہیں اشرفؔ
ان کے قدموں کی آہٹ کے

جامِ سفال و ساغرِ جم دیکھتے نہیں
جو تشنہ لب ہیں ظرفِ کرم دیکھتے نہیں

منزل کی دھن میں غرق ہیں کچھ اس طرح سے آج
ہم آپ کے بھی نقشِ قدم دیکھتے نہیں

وہ سامنے تو آئے پہ نظریں نہ مل سکیں
شاید کریم وقتِ کرم دیکھتے نہیں

اپنی شبِ نشاط پہ ہے آپ کی نظر
در پردہ ہے مری شبِ غم دیکھتے نہیں

راہِ طلب دراز ہے اور عمر مختصر
مڑ کر بھی ہم خدا کی قسم دیکھتے نہیں

کس کا خیال کیسا تصوّر، کہاں کی یاد
تو بتا کہ کب سے تجھے ہم دیکھتے نہیں

اشرف جواب چاہتی ہے ہر نگاہِ شوق
کیوں دیکھیں ہم صنم کو، صنم دیکھتے نہیں

بزمِ امکاں کے چراغوں کی ضیا تھے کل تک
آج جو چُپ ہیں وہی شعلہ نوا تھے کل تک

کچھ اپاہج نظر آتے ہیں سرِ راہگذر
لوگ کہتے ہیں وہی راہنما تھے کل تک

آج کیوں آپ کی نظروں میں ہے اک رنگِ عتاب
ہم بہ قول آپ کے اربابِ وفا تھے کل تک

اقتضا وقت کا ہے دیکھئے کیا آج ہیں آپ
یہ بُھلا دیجئے اب دل سے کہ کیا تھے کل تک

عبرت انگیز ہے ساحل پہ تباہی ان کی
وہ سفینے کہ جو طوفانِ بلا تھے کل تک

جانے کیوں آج نمایاں ہے تحرک ہیں جمود
وہ بھی پتھر کی طرح ہیں جو ہوا تھے کل تک

نبضِ دوراں پہ رہا کرتی ہیں جن کی نظریں
صاف کر لیتے ہیں دل جن سے خفا تھے کل تک

ان کے لب پر بھی ہے اک موجِ تبسم اشرف
جن کی پلکوں پہ دُرِ بیش بہا تھے کل تک

یہ کس کا انتظار ہے محفل کو شام سے
جلتے ہیں کچھ چراغ بڑے اہتمام سے

اے دوست میرا مرتبۂ بے خودی نہ پوچھ
آواز دے رہا ہوں تجھے اپنے نام سے

یہ ترکِ رسم و راہ کا آغاز تو نہیں
دل بدگماں ہے آپ کے طرزِ سلام سے

رندو! ابھی درست نہیں بے تکلفی
ساقی کا نام لو ادب و احترام سے

اڑنے لگا ہے چاند ستاروں پہ آدمی
نزدیک ہو رہا ہے اب اپنے مقام سے

کیا جانے وقت ساتھ بھی دیتا ہے یا نہیں
رفتار میری تیز ہے رفتارِ عام سے

اہلِ جنوں ہی فرضِ محبت کے اہل ہیں
ڈرتے ہیں اہلِ ہوش محبت کے نام سے

عکسِ خیال ہوتا ہے اندازِ گفتگو
انساں کو جانچ لیتے ہیں طرزِ کلام سے

اشرف کشاں کشاں چلے آؤ گے میکدہ
واقف ہیں ہم کرامتِ مینا و جام سے

چارہ سازی خوب فرماتے ہیں آپ
کانٹے بو کر پھول برساتے ہیں آپ

درد دے کر دل کو تڑپاتے ہیں آپ
اور پھر پُرسش بھی فرماتے ہیں آپ

کیوں فریبِ آرزو دے کر ہمیں
وعدۂ فردا سے بہلاتے ہیں آپ

بے رُخی کی حد ہے کوئی بزم میں
دیکھ کر انجان بن جاتے ہیں آپ

چل کے خود راہِ طلب میں ساتھ ساتھ
ہر قدم پر ہم کو بھٹکاتے ہیں آپ

اختیارِ حُسن ہو یا جبرِ عشق
خود سمجھتے ہیں نہ سمجھاتے ہیں آپ

دل میں پیدا کر کے اک جوشِ عمل
حسرتِ ناکام دے جاتے ہیں آپ

کیا گزرتی ہے چمن پر دیکھئے
آج ہمراہِ بہار آتے ہیں آپ

دیکھ کر خاموش اشرفؔ کو کہا
کچھ نہ کہہ کر خوب فرماتے ہیں آپ

ہم بُرا کہتے ہیں اُن کو نہ بھلا کہتے ہیں
غور کرتے ہیں جہاں والے بھی کیا کہتے ہیں

اگر انساں میں نہ ہو جرأتِ اظہارِ خیال
ایسے کم مایہ کو انساں نُما کہتے ہیں

جس اطاعت سے ہوا مردہ ضمیرِ انساں
سخت حیرت ہے کہ آپ اس کو وفا کہتے ہیں

کیا خبر کس کو ہے اس دور میں عرفانِ خدا
لوگ ہر صاحبِ دولت کو خدا کہتے ہیں

جستجو میں تری اک موڑ پہ آئی یہ صدا
جانے والے! حرم و دیر دُعا کہتے ہیں

ہم زمانے کے تلوّن سے ہیں واقف اشرفؔ
ہم کو جو کہتے تھے اچھا، وہ بُرا کہتے ہیں

آدمی ٹھوکریں کھا کھا کے جب انساں ہو جائے
کیا تعجب ہے کہ ہر درد کا درماں ہو جائے

ہم کو کچھ فکر نہیں اپنے سیہ خانے کی
آرزو ہے کہ ہر اک گھر میں چراغاں ہو جائے

باغباں تجھ کو گلستاں کی خبر ہے کہ نہیں
تیرے ہاتھوں نہ کہیں خونِ بہاراں ہو جائے

آہ کھینچوں میں اگر، کوئی میرا ساتھ نہ دے
ساز چھیڑوں تو زمانہ بھی غزل خواں ہو جائے

نیک و بد میں حدِ فاصل کوئی قائم کر دے
کام مشکل سہی لیکن کسی عنواں ہو جائے

تجھ کو دے دوں میں گھڑی بھر کو اگر غم اپنا
دل ترا دل نہ رہے شعلۂ رقصاں ہو جائے

ہے یہی آج کی دنیا کا تقاضا اشرف
غمِ جاناں کا سہارا غمِ دوراں ہو جائے

غمِ دل کا قصّہ کبھی پھر سُناؤ
کوئی نغمۂ زندگی گنگناؤ

دلِ ناتواں کو کہیں پھینک آؤ
نیا دل نئے ولولے ساتھ لاؤ

بہت بڑھ گئے ہیں دلوں کے اندھیرے
اب آؤ محبّت کی شمعیں جلاؤ

نہ آؤ جو آنا تمہارا ہے مشکل
کم از کم کبھی بھول کر یاد آؤ

رہو گے پسِ پردہ مستور کب تک
زمانے کی آنکھوں سے پردہ اُٹھاؤ

شعورِ جہاں ساز سے کام لے کر
کوئی زندگی بخش دُنیا بساؤ

بدل دو ہر اک نقشِ فرسودہ اشرفؔ
بہ عزمِ جواں محفلِ نو سجاؤ

(۴۸)

آئی بہاریں مہکا گُلشن
کلیاں چٹکیں مُرجھایا من

من ہی من میں یاد کے جھولے
آنکھوں آنکھوں برسے ساون

ہر تارا ہے اک چنگاری
رات اندھیری کالی ناگن

ہر وستو میں اُن کی مُورت
ذرّہ ذرّہ جیسے درپن

دل میں بسیں آنکھوں میں براجیں
گھر ہے جس کا اُس کا آنگن

جتنی پگ سے دُور ہے دھرتی
اُتنے من کے پاس ہیں ساجن

آس نراس کے سب دھوکے ہیں
کیسی دُوری کیسا درشن

کس کا شکوہ کیجیے اشرفؔ
اپنا من ہے اپنا دشمن

نہ بہاروں سے نہ گلزار سے جی ڈرتا ہے
کم نگاہئ گل و خار سے جی ڈرتا ہے

کوئی مشکل تو نہیں عرضِ تمنّا لیکن
صرف اپنے دلِ خوددار سے جی ڈرتا ہے

دل کو اقرارِ محبّت کا یقیں کیا آئے
ان کی نیرنگئ گفتار سے جی ڈرتا ہے

ہم سے ہر صورتِ حالات تھی لرزاں کل تک
آج حالات کی رفتار سے جی ڈرتا ہے

کہیں خود فن ہی نہ گر جائے مقامِ فن سے
پست کرداریِ فن کار سے جی ڈرتا ہے

عیب جوئی کے سوا کچھ نہ ہو حاصل جس کا
ایسے تنقید کے معیار سے جی ڈرتا ہے

مسکراہٹ سے مدد لیتے ہیں ہم بھی اشرفؔ
جب کبھی درد کے اظہار سے جی ڈرتا ہے

وہ راہرو بھی مرے ساتھ چلتے رہتے ہیں
قدم قدم پہ جو گرتے سنبھلتے رہتے ہیں

وہی ہیں پھول وہی تازگی ہے پھُولوں کی
چمن پرست مسلسل بدلتے رہتے ہیں

چنا ہے اُن کو زمانے نے رہبری کے لئے
ہمارے نقشِ قدم پر جو چلتے رہتے ہیں

کچھ آپ سے بھی زیادہ حسین شوخ خیال
ہماری فکر کے سانچے میں ڈھلتے رہتے ہیں

کسی کی بزم کا عالم نہ پوچھئے اشرف
ہر آستیں میں کئی سانپ پلتے رہتے ہیں

(۵۱)

اے حسرتِ نظّارہ جو وہ سامنے آئیں
ہم دل کو منائیں، کہ نگاہوں کو منائیں

رہنے بھی دے اے دوست دکھاوے کی یہ باتیں
جب دل نہیں ملتے ہیں تو کیا ہاتھ ملائیں

ہم جانتے ہیں ان کی نگاہوں کا تصرّف
چاہیں تو وہ ہوشیار کو دیوانہ بنائیں

دُکھ درد اِدھر اور اُدھر عیش و طرب ہیں
ہم دل کے صنم خانے کو کس ڈھب سے سجائیں

ماحول میں کانٹے بھی ہیں اور پھُول بھی اشرف
معلوم نہیں ہم کو ہنسائیں کہ رُلائیں

قہرِ مجسّم، حُسنِ مکرّم
آپ ہی شعلہ آپ ہی شبنم

آپ نہ آئے یہ بھی نہ سوچا
بزم میں کتنے دل ہوئے پُر غم

مان بھی لیتے ان کی باتیں
لیکن کچھ آواز تھی مدّھم

آپ یہ آخر کیوں ہیں پشیماں
آپ سے کچھ شاکی تو نہیں ہم

یوں نہ جتاؤ اپنی بڑائی
آپ کی ہستی خود ہے مسلّم

گونجتی ہیں اب تک کانوں میں
باتیں ان کی تھیں یا سرگم

سُن نہ سکے اشرف وہ ہماری
بات تھی سچی ہو گئے برہم

اب گلستاں میں بہاروں کا ہے ماتم تنہا
پھول مرجھا گئے روتی رہی شبنم تنہا

بوئے گل بھی نظر آتی نہیں اب ساتھ ان کے
اس سے پہلے تو وہ رہتے تھے بہت کم تنہا

رہ گئی گردِ سفر بھی کہیں تھک کر شاید
نیم جاں پہنچے ہیں منزل پہ فقط ہم تنہا

شدّتِ ربط ہی احساس ہے تنہائی کا
کوئی رہتا ہے بھری بزم میں ہر دم تنہا

آپ چاہیں تو بگڑ کر بھی مداوا کر دیں
اک تبسّم ہی نہیں درد کا مرہم تنہا

زیست مشکل سہی مرنا بھی تو آساں نہیں
فکر یہ ہے کہ نہ رہ جائے مرا غم تنہا

واقفِ رازِ وفا اور بھی ہوں گے اشرف
ایک تم ہی نہیں اس راز کے محرم تنہا

اجل کا ذکر ہی کیا، زندگی نہیں گزری
رہِ جنوں سے کبھی آگہی نہیں گزری

نہ پوچھے ہم سے کوئی حالِ انتظارِ سحر
کہ ہم گزر گئے اور تیرگی نہیں گزری

تمہارے شہر میں دیکھے ہیں ایسے گوشے بھی
جہاں سے ہو کے کبھی روشنی نہیں گزری

رہے جو کشمکش جبر و اختیار سے دور
اب ان کی جیسی بھی گزری بری نہیں گزری

ازل سے خوگرِ ضبطِ الم ہیں ہم اشرف
ہماری آنکھ سے ہرگز نمی نہیں گزری

نہ ہو جو غم تو مسرّت کی رہگذر کیا ہے
بغیر پردۂ شب، جلوۂ سحر کیا ہے

سپردگیِ مکمل کا ہے عبادت نام
پھر التفات و تغافل پہ منحصر کیا ہے

اُٹھاؤ مصلحت اندیشیوں کے یہ پردے
خلوصِ دل کے سوا عظمتِ بشر کیا ہے

جو سطح بیں ہے بصیرت سے دُور ہے وہ نظر
اُتر نہ جائے جو باطن میں وہ نظر کیا ہے

ہر ایک نقشِ عمل خود حیات کا ہے صلہ
نمود و نام کی پھر سعیِ معتبر کیا ہے

کرم نہیں ہے جو محتاج مشورہ اشرفؔ
دُعا عبث ہے، دُعا کا مری اثر کیا ہے

خود جلوہ گاہِ ناز، اسیرِ نیاز ہے
محمود سے بلند، مقامِ ایاز ہے

سائے مری نظر میں ہیں آئینۂ وجود
ہر عکس میں حقیقتِ آئینہ ساز ہے

شائستۂ مشاہدہ بنتی ہے جب نظر
کھلتا ہے دل پہ عینِ حقیقت مجاز ہے

جتنے بڑھے حجاب ہوئے اور بے نقاب
احساسِ رازداری ہی افشائے راز ہے

ہیں جلوہ گاہِ قدس کے آداب ہی جدا
جو سر یہاں ہے پست وہی سرفراز ہے

ہر سانس چیختی ہے مثالِ جرس مگر
تقدیرِ کارواں ابھی غفلت نواز ہے

اشرفؔ خودی کا ہوش بھی ہے کفرِ بندگی
اب بے خودی کی حد پہ ہماری نماز ہے

منزلِ رنج و مصائب سے گزر جاتے ہیں
دل صدا دیتا ہے ہم جب بھی ٹھہر جاتے ہیں

ہوش مندوں سے وہ دیوانے ہی کچھ اچھے ہیں
شوقِ منزل میں جو منزل سے گزر جاتے ہیں

اور تو اور زمانہ بھی ٹھہر جاتا ہے
جادۂ شوق پہ جب آپ ٹھہر جاتے ہیں

ہم کو معلوم ہے انجام بہارِ نو کا
کر کے ہر پھول پہ افسردہ نظر جاتے ہیں

جب کبھی آتے ہیں ہم لب پہ تبسّم لے کر
آپ کی بزم سے بادیدۂ تر جاتے ہیں

محفلِ زیست سے اٹھنا تھا بہر حال ہمیں
کچھ تکلّف سہی جانے میں مگر جاتے ہیں

غمِ دوراں بھی غزل میں ہو اگر اے اشرف
اور کچھ جوہرِ افکار نکھر جاتے ہیں

(۵۸)

خِرد کے راستے میں ایک موڑ ایسا بھی آیا تھا
جہاں ہر آدمی انساں نہ تھا، انساں کا سایہ تھا

مصیبت نے ہمیں اک آئینہ خانہ دکھایا تھا
کہ جس میں مخلصوں کا ایک اک چہرہ پرایا تھا

مٹائی تھی جنھوں نے لعنتِ دار و رسن پہلے
انہی کو یار لوگوں نے صلیبوں پر چڑھایا تھا

زمانہ کپکپاتا تھا تمہاری سرد مہری سے
دلوں کو تاپنے سورج غموں کی دھوپ لایا تھا

وہ دیوارِ شکستہ آج تک چبھتی ہے آنکھوں میں
کہ جس کو تھام کر ہم نے بھی اک احساں اُٹھایا تھا

کسی نے بھی نہ دیکھا جل رہا تھا آشیاں کس کا
دھواں کچھ اس قدر گلشن کے ایوانوں پہ چھایا تھا

کئی پیاسے تلاشِ آب میں صحرا میں آئے تھے
وہی منظر دوبارہ ذہن کے خوابوں میں آیا تھا

ازل سے بے صدا تھا، بند تھا جو سازِ ہستی میں
تمہیں بھی یاد ہو گا ہم نے وہ نغمہ سُنایا تھا

غمِ آخر غم ہے اشرفؔ بے نیازِ چارہ سازی ہے
تبسم کا بھی لوگوں نے سُنا ہے زہر کھایا تھا

دل کی اک بات چار سُو نہ کرو
غم سہو، اُن کی جستجو نہ کرو

پھول ہیں منتظر گلستاں کے
ہنس کے توہینِ رنگ و بُو نہ کرو

مُسکرا کر یہ آپ کہتے ہیں
اب وفاؤں کی گفتگو نہ کرو

جاگ اٹھے نہ ان کی خود بینی
آئینہ دل کا رُوبرو نہ کرو

غم کے سائے نہ گہرے ہو جائیں
سب کرو، ان کی آرزو نہ کرو

پھر ادا ہو گی اک نمازِ جفا
خونِ دل سے مرے وضو نہ کرو

کچھ تو فرق نیاز و ناز رہے
کام ان جیسا، ہُو بہو نہ کرو

عزّتِ نفس کی قسم اشرفؔ
خُلقِ حسنہ میں بھی غلو نہ کرو

یاس چھا جاتی ہے جب آنکھوں میں کاجل جیسے
آس لہراتی ہے، من میں کوئی آنچل جیسے

دل سے اُٹھتی ہے اک آواز دفورِ غم میں
کوک اُٹھے، موسمِ برسات میں کوئل جیسے

سامنے آ گئے وہ ہم کو خبر تک نہ ہوئی
یوں دبے پاؤں کہ تلوؤں میں ہے مخمل جیسے

زخمِ دل پر وہ سلیقہ سے چھڑکتے ہیں نمک
اشکِ شبنم پہ ہنسے طنز سے پیپل جیسے

کہئے کب تک یونہی اشرف سے رہیں گے برہم
آج بھی آپ کے تیور ہیں وہی کل جیسے

خندہ روئی سے فریبِ حُسن کھا سکتے ہیں ہم
آپ کے وعدوں پہ بھی ایمان لا سکتے ہیں ہم

آپ کی نظروں میں کل کے عام رہرو ہی سہی
رہبروں کو آج کے رستہ دکھا سکتے ہیں ہم

آپ اپنے آنسوؤں کو روک لیں تو بات ہے
مُسکرا کر غم کا افسانہ سُنا سکتے ہیں ہم

بھول جائیں آپ کو یہ ہم سے ممکن ہی نہیں
اس سے کب انکار ہے خود کو بھلا سکتے ہیں ہم

ذرّہ ذرّہ پر ترے نقشِ قدم کا ہے گماں
حد بھی ہے آخر کہاں تک سر جھکا سکتے ہیں ہم

جان کر انجان ہو جانے میں لطفِ خاص ہے
ورنہ کچھ چہروں سے پردے بھی اُٹھا سکتے ہیں ہم

حال کے آئینے کو اشرفؔ نہ سمجھیں بے زباں
ورنہ مستقبل کی باتیں کیا بتا سکتے ہیں ہم

شمعِ محفل جسے بناتے ہیں
اُس کو وہ رات بھر جلاتے ہیں

خود وہاں آستانے آتے ہیں
ہم جہاں اپنا سر جُھکاتے ہیں

راہ پر لائیں ٹھوکریں آخر
دشمنِ راہ کام آتے ہیں

جو کھٹکتے ہیں دل میں صورتِ خار
پھُول کی طرح مُسکراتے ہیں

ہم سے اچھے ہیں مطربانِ چمن
اپنی مرضی سے گیت گاتے ہیں

مدّعائے طلب ہے ترکِ طلب
کھونے والے ہی ان کو پاتے ہیں

عظمتِ غم سمجھ دلِ ناداں!
غم کے پردے میں خود وہ آتے ہیں

نغمۂ ہوش چھیڑ کر اشرؔف
وہ مری بے خودی بڑھاتے ہیں

خونِ گل کے ہیں داغ دامن پر
پھر بھی رونق ہے روئے گلشن پر

کیسے دیکھوں بہارِ نَو تجھ کو
خون کتنے ہیں تیری گردن پر

کتنے پروانے جل کے مرتے ہیں
کب یہ روشن ہے شمعِ روشن پر

ہم کو واعظ پہ آرہی ہے ہنسی
کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہے ہر فن پر

دیکھ کر اپنا گریۂ پیہم
رحم آنے لگا ہے ساون پر

کیا ندامت کے اشک دھوئیں گے
کتنے دھبّے ہیں دل کے دامن پر

میری فطرت عجیب ہے اشرف
رحم آتا ہے مجھ کو دشمن پر

رُلانے کی خاطر نہ کوئی ہنسائے
ہم ایسی عنایات سے باز آئے

شکایت نہ کی آج تک دوستوں کی
لبوں پر مروّت نے تالے لگائے

تماشائے گُل دُور ہی سے حسیں تھا
جو نزدیک پہنچے تو آنسو بھر آئے

ہر آہٹ پہ سانسوں کی دل چیخ اُٹھا
وہ آئے، وہ آئے، وہ آئے، وہ آئے

وہ کہلا رہے ہیں وفائے مجسّم
رہے دُور جن سے وفاؤں کے سائے

بدلتی رہی ہر گھڑی تیری دُنیا
کوئی تیری دنیا سے کیا دل لگائے

اجل بھی کہیں سر سے ٹلتی ہے اشرف
کوئی لاکھ چیخ اُٹھّے یا گڑگڑائے

(٦٥)

کچھ وفاؤں پہ ہم کو تھا وشواس
خیر سے وہ بھی اب نہ آئیں راس

قافلے اشک و آہ کے نہ رُکے
دل کے جذبات تھے جو فرض شناس

جو نظر بھی نہ ڈالے دریا پر
قابلِ قدر ہے اُسی کی پیاس

جب سے تھاما ہے آپ کا دامن
تب سے دل کو نہ خوف ہے نہ ہراس

ربط ہی سے بڑھی ہے بے ربطی
دوستی اب ہے دشمنی کی اساس

نہ تھے تنہائی میں بھی ہم تنہا
دُور رہ کر بھی ہیں وہ اتنے پاس

جانے کس سمت کی ہے موجِ ہوا
دیدہ و دل جھلکے ہیں بہرِ سپاس

تم جو آئے تو آنکھ بھر آئی
آج نکلی ہے میرے دل کی بھڑاس

مادّیت کی چیرہ دستی سے
رُوحِ انسانیت کا ہے افلاس

پوچھتے ہو تو سُن لو اشرف سے
زندگی کیا ہے صرف آس ہی آس

نہ راستوں کا پتہ ہے نہ منزلوں کی خبر
کہاں پہ ختم ہو دیکھیں یہ زندگی کا سفر

یہ اختیار ہے یا جبر، آپ ہی جانیں
نہ زندگی پہ ہے قابو نہ موت سے ہے مفر

سکوتِ شامِ الم میں بھی یہ ہوا محسوس
کہ جیسے کوئی دبے پاؤں آ رہا ہے اِدھر

رُکی رُکی سی ادائیں جھکی جھکی نظریں
یہ اعترافِ محبت ہے یا فریبِ نظر

سُلا دیا ہے تھپک کر انھیں شبستاں میں
اب اور کیا ہو مرے نالہ ہائے شب میں اثر

بہارِ عشق نے بخشی ہے سُرخروئی بھی
ہیں دل کے زخم ہرے خوں اُگل رہا ہے جگر

جھکا دیئے ہیں محبّت نے ایسے دل اشرف
جنھیں جھکا نہیں سکتے تفنگ و تیر و تبر

ہر زاویے سے وقت کے سانچے میں ڈھل گیا
دنیا وہی ہے آج بھی، انسان بدل گیا

وہ بھی تھا وقت جب یہ زمانہ تھا میرے ساتھ
یہ بھی ہے وقت مجھ سے زمانہ بدل گیا

اتنی شدید ہو گئی طوفاں کی آرزو
ساحل کا شوق ہی مرے دل سے نکل گیا

دھندلی ہے کس قدر تری محفل کی روشنی
شاید کوئی جلاتے ہوئے شمع جل گیا

اشرف تمام حوصلے ظاہر نہ ہو سکے
تیور ہمارے دیکھ کے طوفان ٹل گیا

نغمۂ بلبل میں ہے پنہاں نہ لے میں ساز کی
خندۂ گُل میں نزاکت ہے تری آواز کی

آپ سا کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے ضرور
ہر زمانہ کو ضرورت ہے زمانہ ساز کی

ہوشمندوں سے کبھی نظریں ملاتا ہی نہیں
اک یہی پہچان ہے بس آپ کے ہمراز کی

آہِ آخر پر مری کیوں چونک اُٹھے دفعتاً
آپ نے آواز سن لی کیا شکستِ ساز کی

ان کو تڑپاتا ہے اشرفؔ آج شوقِ التجا
دیکھنا وہ التجا کرتے ہیں کس انداز کی

٦٩

پلا کچھ اور ابھی دَور ہی چلے کتنے
تجھے خبر ہی نہیں خشک ہیں گلے کتنے

نہ پوچھ دفن ہیں کتنی اُمیدیں، کتنے خیال
دل و دماغ میں آئے ہیں زلزلے کتنے

تمہاری بزم ہی خود مسئلہ نہ بن جائے
ہر ایک گوشے سے اُٹھتے ہیں مسئلے کتنے

مذاق اڑانے لگا ہے ہر ایک میکش کا
بلند ہو گئے ساقی کے حوصلے کتنے

بُرا نہیں مری سنجیدگی کا جاہ و جلال
تُنک مزاجوں سے اُلجھے معاملے کتنے

ابھی جلاؤ نہ محفل میں فکر کی شمعیں
ابھی بجھے ہوئے بیٹھے ہیں دل جلے کتنے

پسند آئی ہے فکرِ سخن ہمیں اشرف
ہمارے سامنے تھے اور مشغلے کتنے

(۷۰)

واقف نہ تھے کسی کی کبھی دشمنی سے ہم
پہچاننے لگے ہیں تری دوستی سے ہم

اس خوف سے کچھ اور بھی کرتے ہیں لغزشیں
گِر جائیں خود نہ مرتبۂ آدمی سے ہم

جو ہے ہمارا حال وہی سب کا حال ہے
رُودادِ عشق پوچھیں گے اب کیا کسی سے ہم

پروانوں کو جلاتی ہے جب شمع کی ضِیا
اے دوست کیا اُمید رکھیں روشنی سے ہم

وہ بھی ہیں مئے کشی کا ارادہ کئے ہوئے
توبہ نہ کرلیں آج کہیں میکشی سے ہم

ہو جاتی آزمائشِ احباب خود بخود
کچھ کام لے سکے نہ تری دشمنی سے ہم

چہرے وہی ہیں سامنے، وہ دل نہیں رہے
خود اپنی بزم ہی میں ہیں اب اجنبی سے ہم

پابندِ مصلحت تھا سوالِ ستم شعار
دیتے رہے جواب فقط خامشی سے ہم

رنگِ بہار دیکھ کر مُرجھا گیا ہے دل
اشرفؔ چمن میں آئے تھے کتنی خوشی سے ہم

(۷۱)

تردّد میں ہیں سب، کعبوں کا بُت خانوں کا کیا ہوگا
مجھے یہ فکر ہے گمراہ انسانوں کا کیا ہوگا

بہار آتے ہی پہلی بات یہ کہتے ہیں دیوانے
چمن آراستہ ہے ہائے ویرانوں کا کیا ہوگا

حقیقت پھر حقیقت ہے سمجھ لو سوچ لو تم بھی
زباں کھولیں گے ہم جس وقت افسانوں کا کیا ہوگا

غریبوں کو جگہ ملتی نہیں ہے سر چھپانے کو
یہی عالم رہا کچھ دن تو ایوانوں کا کیا ہوگا

بھلا یہ آبروئے جام و مینا رہ بھی سکتی ہے
اگر مینخوار اُٹھ جائیں تو میخانوں کا کیا ہوگا

ہمارے دم سے طوفانوں کا زور و شور قائم ہے
ہمارے ڈوبنے کے بعد طوفانوں کا کیا ہوگا

اسیروں کی رہائی سے کوئی خطرہ نہیں لیکن
نگہبانوں کو یہ ڈر ہے کہ زندانوں کا کیا ہوگا

یہ تبدیلی نظامِ میکدہ پر ظلم ہے ساقی
تو آنکھوں سے پلا دے گا تو پیمانوں کا کیا ہوگا

بجھا کر شمع خود ہی دیکھ لو اشرفؔ سے مت پوچھو
بُجھے گی شمعِ محفل جب تو پروانوں کا کیا ہوگا

(۷۲)

اگر وہ شورشِ طوفاں کا سامنا کرتے
سکون نواز کناروں سے کیوں ڈرا کرتے

اگر وقارِ محبّت سے اذن مل جاتا
تمہارا نام ہی آہستہ لے لیا کرتے

مقامِ صبر میں آتا جو بد دُعا کا خیال
ہمارے ہاتھ دُعا کے لئے اٹھا کرتے

زمانے والوں سے اُلجھے ہیں جس مقام پہ ہم
اسی مقام پہ ہوتے تو آپ کیا کرتے

کسی نے بزم میں پوچھا نہ ہم سے قصۂ دل
خلافِ قاعدہ ہم کیسے ابتدا کرتے

زمانہ میں جنھیں انسانیت کے دعوے ہیں
کبھی تو وہ حقِ انسانیت ادا کرتے

ترے کرم کی حقیقت ابھی نہیں معلوم
وگرنہ اہلِ خطا اور بھی خطا کرتے

رہِ وفا میں ہیں کس درجہ سختیاں اشرف
ہمارے ساتھ وہ ہوتے تو کیا وفا کرتے

پناہ دے کہیں میرے لئے پناہ نہیں
ترے کرم سے زیادہ مرے گناہ نہیں

ہماری شورشِ فریاد کے ہیں سب شاہد
مگر تمہارے ستم کا کوئی گواہ نہیں

نظر کے ساتھ ذرا کام لیجے فکر سے بھی
مقامِ درس ہے دنیا یہ سیر گاہ نہیں

اُنھیں چمن پہ تصرّف کا حق نہیں ہے جنھیں
گُلوں سے ربط ہے کانٹوں سے رسم و راہ نہیں

ترا مقام معیّن اگر نہیں، نہ سہی
ہمارا سجدہ بھی محتاج سجدہ گاہ نہیں

سزائے دار بھی ملتی ہے سوچ لو اشرف
خدا گواہ! کہ اظہارِ حق گناہ نہیں

اجل نصیبوں کی حالت ہے کیا خدا جانے
یہ کس نے چھیڑ دیئے زندگی کے افسانے

کبھی تو کام لیں اپنے دلوں کے شعلوں سے
پرائی آگ میں کب تک جلیں گے پروانے

ابھی ہے صاحبِ دل کی کچھ آبرو باقی
ابھی ہیں بزم میں کچھ لوگ جانے پہچانے

قریب بیٹھنے والوں کا رنگ ڈھنگ نہ پوچھ
خلوص کے ہیں مخالف وفا سے بیگانے

اُتر رہا ہے ہر اک ہوش مند کا چہرہ
بہار پوچھ رہی ہے کہاں ہیں دیوانے؟

سوالِ مئے کا انھیں کوئی حق نہیں اشرف
جو اپنے ہاتھ سے خود توڑ بیٹھے پیمانے

اندھیرے رُخ بدلتے جا رہے ہیں
چراغِ بزم جلتے جا رہے ہیں

بلند و پست ہے کیا راہِ ہستی
سبھی گرتے سنبھلتے جا رہے ہیں

بدل لیتے ذرا بے کیف بادہ
وہ جام و خُم بدلتے جا رہے ہیں

کہاں ممکن ہے منزل تک رسائی
نئے رستے نکلتے جا رہے ہیں

ابھی دل میں ہے کچھ جان باقی
ابھی ارماں نکلتے جا رہے ہیں

ذرا اندازِ پا کا دھیان رکھنا
نقوشِ پا بدلتے جا رہے ہیں

مرے آنسو تھمیں کس طرح اشرفؔ
نئے چشمے اُبلتے جا رہے ہیں

مانا کہ ہم کو حرف و حکایت کا ہوش ہے
کیا لب ہلائیں کون یہاں حق نیوش ہے

شاید تمام گرمیٔ محفل ہمیں سے تھی
ہم کیا خموش ہیں کہ زمانہ خموش ہے

نیرنگیٔ حیات میں کھوئے ہوئے ہیں سب
نیرنگیٔ حیات کا اب کس کو ہوش ہے

پردے اُٹھے تو اور وہ پردوں میں چھپ گئے
شاید نگاہِ شوق ہی خود پردہ پوش ہے

اشرؔف بہ غور دیکھ ذرا چہرۂ غزل
دردِ نہاں کا رنگ ہے حسن ہر وش ہے

(۷۹)

تیری محفل میں آ کے جو بیٹھے
فکر و غم سے وہ دُور ہو بیٹھے

یاد آیا خُدا ہ خُدا کی قسم
ناخدا ناؤ جب ڈبو بیٹھے

زندگانی کے انقلاب میں ہم
ایک ہی دل تھا وہ بھی کھو بیٹھے

ڈوب کر ہم خیالِ ماضی میں
کتنی یادوں کو آج رو بیٹھے

ختم کر دیجیے داستانِ وفا
سُننے والے ہی ہوش کھو بیٹھے

چند اظہارِ عشق کے الفاظ
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

الاماں! رہروانِ غم کی تھکن
پھر نہ اٹھے زمیں پہ جو بیٹھے

غور کر اپنے عہدِ روشن پر
ذرّے سب آفتاب ہو بیٹھے

ان کے اشکوں کو دیکھ کر اشرف
پھول شبنم سے ہاتھ دھو بیٹھے

(۸۰)

نہیں شعورِ نظر کسی میں
ہزاروں غم ہیں مری ہنسی میں

نہیں ہے معیار کوئی باقی
نہ دشمنی میں نہ دوستی میں

نہ چھیڑ ان کو اے جذبۂ دل
وہ رو پڑیں گے ہنسی ہنسی میں

پیمبرِ تیرگی بھی اک دن
ضرور آئیں گے روشنی میں

ذرا کوئی راہبر سے کہہ دے
کہ رازِ منزل ہے گمرہی میں

مذاقِ محفل گرا ہوا ہے
نہ ٹوٹے دل کوئی دل لگی میں

بجھی ہوئی شمع ساتھ لے کر
بھٹک رہے ہیں وہ تیرگی میں

خدا کا عرفاں یہی ہے اشرف
کہ لطف آجائے بندگی میں

(٨١)

مرا دل جو ٹوٹا ہوا ساز ہے
بایں حال تیرا ہم آواز ہے

نمایاں ہے معیارِ عقل و خرد
مقامِ جنوں راز در راز ہے

چمن جل رہا ہے ترا، باغباں!
کہاں تیری فکرِ چمن ساز ہے

ازل سے نگوں سر ہے رنگِ مجاز
حقیقت ابد تک سرافراز ہے

چمن سے اڑو بوئے گل کی طرح
اگر واقعی شوقِ پرواز ہے

ابھی تک تو ہیں جام سب کے تہی
یہ مانا درِ میکدہ باز ہے

کسی بات کی فکر اشرف نہ کر
تری بات گر دل کی آواز ہے

خموشی چھا گئی اربابِ محفل سر جھکا بیٹھے
یہ کیوں بیٹھے بٹھائے ہم تری محفل میں آ بیٹھے

وفا کی سخت راہوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا
کسی کی رہنمائی کو ہم اپنا دل جلا بیٹھے

سمجھتے کاش تم کھوٹے کھرے کا فرق دنیا میں
عدو کو دوست سمجھے، دوست کو دشمن بنا بیٹھے

وہی ہم ہیں، وہی دنیا، وہی دنیا کی رنگینی
مگر احباب اقدارِ محبت ہی بھلا بیٹھے

ابھی محروم ہے اپنی جبیں، ذوقِ عبادت سے
یہ کس کے سنگِ در پر آ کے اپنا سر جھکا بیٹھے

جنابِ شیخ کے سر آ گیا الزام مے نوشی
گھڑی بھر کے لئے وہ جا کے میخانے میں کیا بیٹھے

بس اتنی بات پر ہے برق برہم آج تک اشرف
کہ اپنے ہاتھوں اپنا آشیانہ ہم جلا بیٹھے

خبر رہائی کی پہنچائی جب سفیروں نے
قفس میں دی ہے خزاں کو دُعا اسیروں نے

یہ تیرے جود و کرم کا ملا ہمیں بھی فیض
پتہ دیا ہے ترا شہر کے فقیروں نے

بہت ہی دُور سے آئے تھے تم سے ملنے
تمہارے کوچے میں بھٹکا دیا شریروں نے

بتا دیا ہے خموشی سے حالِ دل میرا
غضب کیا ہے مرے ہاتھ کی لکیروں نے

وفا شعاروں پہ ظلم و ستم کا ہے یہ صلہ
ڈبویا نامِ وفا آپ کے مشیروں نے

وہی ضمیر جو تھا کاروانِ دل کا جرس
اسے تھپک کے سُلایا ہوس اسیروں نے

نگاہِ شاہ رعایا کے مال پر جو رہی
تو پورے ملک کا سودا کیا وزیروں نے

اٹھی غریب کی کٹیا سے دکھ بھری آواز
کئے بلند اُدھر قہقہے امیروں نے

قدم قدم پہ تھی اک لاش راہ میں اشرف
مگر نہ دیکھا پلٹ کر بھی راہگیروں نے

آپ کہہ دیں کہ تو ہمارا ہے
پھر تو ہر اک ستم گوارا ہے

دل کے بدلے ہے طُور پہلو میں
اسی جلوے نے ہم کو مارا ہے

دَیر کا صحن ہو کہ طاقِ حرم
ذکر ہر اک جگہ تمہارا ہے

آپ بڑھ کر سنبھالیے نہ مجھے
میرا دل ہی بڑا سہارا ہے

ڈوبنے والے پست ہمت ہیں
ورنہ ہر موج میں کنارا ہے

اک نگاہِ کرم نے اپنوں کی
غیر کی طرح ہم کو مارا ہے

علم کے میکدہ پہ اب اشرف
ساغرِ جہل کا اجارا ہے

وفا سی شئے کی ہنسی جب اُڑائی جاتی ہے
دل و دماغ میں ہلچل سی پائی جاتی ہے

نگاہ و دل میں وہاں نُور ہی نہیں رہتا
جہاں بھی شمعِ حقیقت بجھائی جاتی ہے

تمہارے نقشِ قدم کے حسیں سہاروں سے
بھٹکنے والوں کو منزل بتائی جاتی ہے

کسی کی بزم میں ہوتا ہے جب اندھیرا سا
ہماری مشعلِ دل ہی جلائی جاتی ہے

ہر اک گناہ سے پہلے ضمیر کی آواز
گناہ گار کو اکثر سُنائی جاتی ہے

کسی کا ذکر شرارت ہے اُن کی یہ اشرف
کہ اس طرح بھی وفا آزمائی جاتی ہے

(۸۶)

وہ چاہیں تو ادراک کی حد سے پرے جائیں
چاہیں تو مرے دل کے دریچوں سے در آئیں

وابستہ بہرحال ہیں دامن سے انھیں کے
اب ان کی خوشی ہم کو ہنسائیں کہ رُلائیں

اس عہدِ ترقی میں میرے شہر میں لوگو!
آشاؤں کے چندن میں سُلگتی ہیں چتائیں

فریاد کی طاقت نہ سفارش ہے گوارا
زیبا تو نہیں آپ غریبوں کو ستائیں

اتنا تو ابھی تنگ نہیں ضبط کا دامن
کر لیجئے کچھ اور جو کرنی ہیں جفائیں

آتا ہے یہاں سب کو بلندی سے گرانا
وہ لوگ کہاں ہیں کہ جو گرتوں کو اٹھائیں

ہر تن پہ نیا چہرہ ہے اس روپ نگر میں
حیراں ہیں کہ کس چہرے کو آئینہ دکھائیں

وہ دن گئے کشتی کو تھا طوفان سے خطرہ
اب فکر ہے کیسے اُسے ساحل سے بچائیں

اشرف کوئی سیکھے یہ خدایانِ جہاں سے
انصاف کی گردن پہ چھُری کیسے چلائیں

(۸۷)

تم ہم کو تغافل سے پریشاں نہ سمجھنا
تم ہم کو بُھلا دو گے یہ آساں نہ سمجھنا

بے ساختہ آنکھوں میں مری آ گئے آنسو
اِن کو کسی افسانے کا عنواں نہ سمجھنا

سر نذر ہوا کرتے ہیں اس راہ میں اکثر
اس مرحلۂ عشق کو آساں نہ سمجھنا

ہے شام و سحر اس میں تمہارا ہی تصور
تم دل کو ہمارے کبھی ویراں نہ سمجھنا

سوئے ہوئے ساحل پہ یہ دریا کا کرم ہے
پیغامِ عمل ہے اسے طوفاں نہ سمجھنا

کردار ہوا کرتے ہیں صورت گرِ انساں
ہر صورتِ انسان کو انساں نہ سمجھنا

ہے بات کسی کی تو زبانی ہے کسی کی
غنچوں کی ہنسی فیضِ بہاراں نہ سمجھنا

دل ان کا ہے، اس میں کوئی حسرت ہو نہ ارمان
ہیں صاحبِ خانہ، انھیں مہماں نہ سمجھنا

اشرف یہ نمک پاشی کا انداز حسیں ہے
تم پرسشِ احوال کو درماں نہ سمجھنا

عمر تحلیل ہوئی، حل نہ ہوئی مشکلِ شب
زندگی چلتی رہی پا نہ سکی منزلِ شب

انتظار ان کا ہے افسانۂ غم کا عنوان
اور کیا کیجیے بیاں اس کے سوا حاصلِ شب

زندگی سلسلۂ تیرہ شبی ہے شاید
صبحِ روشن بھی نظر آئی ہمیں شاملِ شب

کئی مجنوں نظر آتے ہیں یہاں فاتحہ خواں
کتنی لیلاؤں کا مدفن ہے یہی محملِ شب

سارے ارمانوں کی لاشوں پہ اجل ہے رقصاں
ایک خاموش سا نغمہ ہے تری محفلِ شب

خیر دل پر جو گزرنی تھی وہ گزری اشرف
غم تو اس کا ہے کہ تھا دل کا مکیں بسملِ شب

غمِ دل سے نسبت نہ تھی ہم کو پہلے
کسی سے محبّت نہ تھی ہم کو پہلے

نہ تھی کشمکش اتنی قلب و نظر میں
سکوں کی ضرورت نہ تھی ہم کو پہلے

بڑھے جا رہے ہیں قدم سوئے مقتل
اجل سے یہ رغبت نہ تھی ہم کو پہلے

نظارہ ہے جاں اور نظر مثلِ تن ہے
کبھی واقفیت نہ تھی ہم کو پہلے

ہوا پر بھی آوازِ پا کا ہے دھوکا
جنوں پر مسرّت نہ تھی ہم کو پہلے

جھپکتی نہیں آنکھ در پر ہیں نظریں
کبھی اتنی فرصت نہ تھی ہم کو پہلے

حیاتِ محبّت کا ہر راز اشرفؔ
چھپانے کی عادت نہ تھی ہم کو پہلے

اس طرح اپنی وفا کا ہم صلہ پاتے رہے
شب کا چہرہ صبح کی کرنوں سے دھلواتے رہے

ایک ہی صورت نظر آتی رہی ہر حال میں
آئینہ بن کر ہمیں آئینہ دکھلاتے رہے

کھا گئی دھوکہ نظر، دل مضطرب ہے حسبِ حال
وہ ہمارے سامنے آتے رہے جاتے رہے

طنز دل میں لب پہ ابھری ہے تبسم کی لکیر
کتنے کانٹے دل میں بو کر پھول برساتے رہے

حالِ دل افشا نہ ہو اشرف کہیں اس بات سے
ہم ہمیشہ دوستوں سے ملتے گھبراتے رہے

شبِ غم اتنی مختصر ہو جائے
دور دل سے غمِ سحر ہو جائے

جانے کیا انقلاب برپا ہو
دل کی دل کو اگر خبر ہو جائے

دل میں احساسِ غم اگر جاگے
خضرؑ کی عمر مختصر ہو جائے

ننگ ہے آرزوئے چارہ گری
درد خود اپنا چارہ گر ہو جائے

جو سمجھ لے بہار کا انجام
چشمِ نرگس بھی دیدہ ور ہو جائے

زندگی پر کھلے جو رازِ اجل
آدمی صاحبِ نظر ہو جائے

شرط ہے ذوقِ بندگی اشرفؔ
سر جہاں خم ہو اُن کا در ہو جائے

(۹۲)

اب آپ کے شایانِ جفا کون ملے گا
ہم سا کوئی پابندِ وفا کون ملے گا

ہر گام پہ کی آپ نے اک شمع تو روشن
پروانۂ نقشِ کفِ پا کون ملے گا

کچھ عام نہیں رہ گذرِ منزلِ تسلیم
ہر حال میں راضی برضا کون ملے گا

انسان ہیں کچھ بھول تو ہو جاتی ہے ہم سے
سرزد نہ ہوئی جس سے خطا کون ملے گا

ہر جلوہ میں ہے تیری ہی یکتائی کا عالم
ڈھونڈھوں جو تجھے تیرے سوا کون ملے گا

ناکام نہ ہو جائے کہیں ذوقِ عبادت
سر جھکتے ہی آتی ہے صدا کون ملے گا

سنتے ہیں بروں کے لئے ہے آپ کی رحمت
فرمایئے اشرف سے برا کون ملے گا

کام جاری رہے ہر کوشش ناکام کے بعد
اور اک شام سہی درد بھری شام کے بعد

تیرگی بڑھ کے ہمیں دے گی اُجالوں کا پیام
صبح ہو جائے گی خود گردشِ ایّام کے بعد

جہدِ پیہم کے سوا کچھ نہیں تعبیرِ حیات
اک نئی راہ نظر آئی ہر انجام کے بعد

بے وفا کہئے کہ جی کھول کے رُسوا کیجیے
حوصلے اور بڑھے دل کے ہر الزام کے بعد

اعتبار اپنا تری ہستی موجود سے ہے
اب کسی اور کا کیا ذکر ترے نام کے بعد

دلِ حسّاس ملا ہے ترے دیوانے کو
دیکھ سکتا نہیں جلتے ہوئے پروانے کو

بُت اُمیدوں کے اُسی شان سے ہیں جلوہ نما
آپ کعبہ نہ کہیں دل کے صنم خانے کو

اک ذرا کشمکشِ زیست سے گھبراتا ہے
موت کا خوف نہیں ہے ترے دیوانے کو

آپ واپس نہیں لے سکتے جب اپنے الفاظ
کچھ تو کہیئے دلِ خود دار کے سمجھانے کو

میرِ محفل ہی نے دستور میں کی ہے ترمیم
اہلِ محفل پہ کھلے دل سے ستم ڈھانے کو

میکش آسانی سے کر سکتے ہیں توبہ شکنی
دیکھ سکتے نہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے کو